دعوتِ حق



مولانا وحید الدین خاں

دعوتِ حق

احکام، واقعات، امکانات

مولانا وحید الدّین خاں

Dawat-e-Haq
By Maulana Wahiduddin Khan

First published 1998

Al-Risala Books
The Islamic Centre
1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi 110 013
Tel. 4611128, 4611131
Fax 91-11-4697333

Distributed in U.K. by
IPCI: Islamic Vision
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

Distributed in U.S.A. by
Maktaba Al-Risala
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn, New York NY 11230
Tel. 718-2583435

Printed by Nice Printing Press, Delhi

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

دعوت الی اللہ

دعوت و تبلیغ کو قرآن میں دعوت الی اللہ کہا گیا ہے۔ یعنی اللہ کی طرف بلانا۔ انسان کو اس کے خالق و مالک کے ساتھ جوڑنا۔ اللہ کی طرف بلانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کو یہ بتایا جائے کہ اللہ کی زمین پر تمہارے لیے زندگی کا صحیح طریقہ صرف یہ ہے کہ تم اللہ کے بندے بن کر رہو۔

انسان کے لیے دنیا کی زندگی میں صرف دو رویے ممکن ہیں۔ ایک خود رخی اور دوسرا خدا رخی۔ خود رخی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خود اپنی ذات کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائے۔ وہ اپنی سوچ کے مطابق چلے۔ وہ اپنی خواہشوں کی پیروی کرے، وہ اپنے ذاتی تقاضوں کی تکمیل کو زندگی کی کامیابی قرار دے۔ اس کے مقابلہ میں خدا رخی طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو خدا کا ماتحت سمجھے، وہ اپنے جذبات کو خدا کے تابع بنائے۔ اس کے نزدیک زندگی کی کامیابی یہ ہو کہ وہ خدا کی پسند کے مطابق جئے اور خدا کی پسند ہی پر اس کا خاتمہ ہو جائے۔

خود رخی زندگی میں گھمنڈ، حسد، انانیت جیسے جذبات جاگتے ہیں۔ انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ حق وہ ہے جس کو وہ حق سمجھے اور باطل وہ ہے جس کو وہ باطل قرار دے۔

خدا رخی زندگی کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ خدا رخی زندگی آدمی کے اندر عبدیت، تواضع، اعتراف، خود احتسابی جیسے جذبات ابھارتی ہے۔ پہلی صورت میں انسان اگر خود پرست بن جاتا ہے تو دوسری صورت میں خدا پرست۔

دعوت الی اللہ یہ ہے کہ آدمی کو خود رخی زندگی کے برے انجام سے آگاہ کیا جائے اور اس کو خدا رخی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دی جائے۔ ان دونوں قسم کی زندگیوں کو جاننے کا معتبر اور مستند ماخذ خدائی تعلیمات ہیں جو قرآن کی صورت میں محفوظ طور پر ہمارے پاس موجود ہیں۔ دعوت الی اللہ کا کام ایک خالص اخروی نوعیت کا کام ہے۔ قومی یا اقتصادی یا سیاسی معاملات سے براہِ راست اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ انسان کو خدا اور آخرت کی طرف بلانے کی ایک مہم ہے۔ اسی دینی اور روحانی اسلوب میں وہ شروع ہوتی ہے اور

اپنے اسی اسلوب میں وہ آخر وقت تک جاری رہتی ہے۔

دعوت الی اللہ کا کام اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک خدائی کام ہے، جس کو بندوں کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کو اسی اسپرٹ کے ساتھ انجام دیا جائے۔ اس اسپرٹ کے بغیر جو کام کیا جائے وہ دعوت الی اللہ کا کام نہ ہوگا، خواہ اس کو دعوت الی اللہ کے نام پر جاری کیا گیا ہو۔

دعوت الی اللہ نہ سیاست کی طرف بلانے کا کام ہے اور نہ قومی مسائل کی طرف بلانا اس کا نشانہ ہے۔ یہ مکمل طور پر خدا کی طرف بلانے کا ایک کام ہے اور اسی خاص صورت میں اس کو ادا کیا جانا چاہیے۔

خدا کی طرف بلانے سے کیا مراد ہے۔ اس کا ابتدائی مقصد یہ ہے کہ انسان کو خدا کے تخلیقی منصوبہ سے آگاہ کیا جائے۔ اس کو بتایا جائے کہ خدا کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے اور خدا آئندہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہے۔ یہ گویا انسان کو خدا سے متعارف کرنے کا ایک کام ہے۔ اس کا نشانہ یہ ہے کہ خدا کے بارہ میں انسان کی غفلت ٹوٹے اور وہ اپنی بندگی کا ادراک کرکے خدا کی طرف متوجہ ہو جائے۔

اس عمل کا نشانہ یہ ہے کہ انسان خدا کی ذات کو پہچانے۔ وہ خدا کی قدرت کے مقابلہ میں اپنے عجز کو دریافت کرے۔ غیب کا پردہ پھاڑے جانے سے پہلے وہ خدا کا مشاہدہ کرے۔ خدا سے براہِ راست سابقہ پیش آنے سے پہلے وہ بالواسطہ طور پر خدا کی معرفت حاصل کرے۔

دعوت کا مقصد انسان کے اندر سوئی ہوئی روح کو جگانا ہے۔ یہ بھٹکے ہوئے انسان کو خدا کی طرف جانے والے سیدھے راستے پر کھڑا کرنا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر اس بصیرت کو جگایا جائے جو کائنات کی نشانیوں میں خدا کے جلوؤں کو دیکھنے لگے۔ جو مخلوقات کے آئینہ میں اس کے خالق کو بلا حجاب پالے۔

دعوت ایک انسان کو اس قابل بنانے کا نام ہے کہ وہ براہِ راست اپنے رب سے مربوط ہو جائے۔ اس کو روحانی سطح پر خدا کا فیضان پہنچنے لگے۔ اس کے دل و دماغ خدا کے نور سے منور ہو جائیں۔ اس کا پورا وجود خدا کی رحمت کی بارشوں میں نہا اٹھے۔

دعوت کا نشانہ یہ ہے کہ آدمی دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کی مخلوق بن جائے۔ وہ دنیا کی عظمتوں میں خدا کی عظمت کو دریافت کرے۔ وہ دنیا کی نعمتوں میں جنت کی نعمتوں کا تجربہ کرنے لگے۔ دنیا کی تکلیفیں اس کو جہنم کی تکلیف یاد دلائیں۔ دنیا کے مناظر اس کو آخرت کی حقیقتوں کا مشاہدہ کرانے لگیں۔ یہی دعوت کا نشانہ ہے اور ایسے ہی انسانوں کو وجود میں لانا دعوت اور داعی کی کامیابی۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کو احسن تقویم کی صورت میں پیدا کیا۔ پھر اس کو گرا کر اسفل سافلین میں ڈال دیا (التین) دعوتی عمل کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو دوبارہ اس کی اصل ابتدائی حالت کی طرف لوٹائے۔ جنت سے نکالے جانے کے بعد اس کو دوبارہ جنت میں داخل کرے۔ خدا کی رحمت سے دور ہونے والوں کو دوبارہ خدا کی رحمت کے سایہ میں پہنچا دے۔

انسان کی مثال ایسی ہے جیسے پانی کی ایک مچھلی جس کو پانی سے نکال کر صحرا میں ڈال دیا جائے۔ ایسی مچھلی صحرا میں مسلسل تڑپ رہی ہوگی۔ اور اس کے ساتھ بہترین ہمدردی یہ ہوگی کہ اس کو دوبارہ پانی کی طرف لوٹا دیا جائے۔

انسان بھی اسی طرح جنت کی ایک مخلوق ہے۔ اس کے اندر ایک نامعلوم آئیڈیل کو پانے کا جذبہ بے پناہ حد تک پایا جاتا ہے۔ ہر آدمی اپنے اس نامعلوم آئیڈیل کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ وہ بار بار دنیوی رونق والی کسی چیز کی طرف لپکتا ہے اس امید میں کہ وہ جس آئیڈیل کی تلاش میں ہے وہ شاید یہی ہے مگر ہر بار اسے ناکامی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ مر جاتا ہے بغیر اس کے کہ اس نے اپنے آئیڈیل کو پایا ہو۔

یہی وہ مقام ہے جہاں داعی کو اپنا دعوتی عمل انجام دینا ہے۔ داعی کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کو بتائے کہ وہ جس آئیڈیل کی تلاش میں ہے وہ صرف خدا اور اس کی جنت ہے۔ یہ صرف خدا ہے جس کو پا کر آدمی اپنے آئیڈیل کو پالے۔ یہ صرف جنت ہے جہاں پہنچ کر آدمی اس اطمینان سے دوچار ہو کہ وہ جس دنیا کی تلاش میں تھا وہ دنیا اسے حاصل ہو گئی۔

اس اعتبار سے ہر انسان داعی کا نشانہ ہے۔ داعی کو ہر فرد تک پہنچنا ہے۔ اسے ہر

آنکھ پر پڑے ہوئے پردہ کو ہٹانا ہے۔ گویا دنیا میں اگر چھ بلین انسان ہیں تو داعی کو چھ بلین کام کرنا ہے۔ اسے چھ بلین روحوں کو ان کے خدا سے ملانا ہے۔ اسے چھ بلین انسانوں کو ان کی جنتی قیام گاہ تک پہنچانے کی کوشش کرنا ہے۔

اسی معلم انسانیت کا نام داعی ہے۔ داعی وہ ہے جو زندگی کے راستوں پر روشنی کا مینار بن کر کھڑا ہو جائے۔ جو انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلوں کے لیے خدائی رہنما بن جائے۔

قرآن کی سورۃ نمبر ۵۱ میں پیغمبر کی زبان سے کہا گیا ہے کہ: ففروا الی اللہ انی لکم منہ نذیر مبین یعنی اے لوگو! اللہ کی طرف دوڑو، میں اس کی طرف سے تمہارے لیے ایک کھلا ڈرانے والا ہوں (الذاریات ۵۰) اسی بات کو دوسری جگہ قرآن میں ان الفاظ میں فرمایا کہ: اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت۔ یعنی اے لوگو! اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو (النحل ۳۶)

یہی دعوت الی اللہ کا اصل نکتہ ہے۔ تمام پیغمبروں نے اپنے زمانہ کے لوگوں کو اسی سے آگاہ کیا۔ بعد کے دور کے داعیوں کو بھی اپنے زمانہ کے لوگوں کو اسی حقیقت سے آگاہ کرنا ہے۔

اس دنیا میں انسان دو پکاروں کے درمیان ہے۔ ایک خدا کی پکار، اور دوسرے شیطان (طاغوت) کی پکار۔ خدا خیر کا سرچشمہ ہے۔ اور وہ لوگوں کو خیر کی طرف بلا رہا ہے۔ اس کے برعکس شیطان شر کا سرچشمہ ہے۔ وہ لوگوں کو شر کے راستوں کی طرف بلاتا ہے۔ آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ شیطان کے فریب میں نہ آئے اور اس کو چھوڑ کر خدا کی طرف دوڑ پڑے۔

خدا تمام صفات کمال کا جامع ہے۔ وہ عدل، رحمت، سچائی، دیانت داری اور اخلاص کو پسند کرتا ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ انسان انھیں اعلیٰ اوصاف کو اپنائے۔ وہ اپنے آپ کو خدائی اخلاقیات میں ڈھال لے۔

اس کے برعکس شیطان برائیوں کا مجموعہ ہے۔ اور وہ انسانوں کو بھی برائیوں کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ شیطان آدمی کے اندر چھپے ہوئے بدی کے جذبات کو بھڑکاتا ہے۔ وہ

آدمی کے اندر حسد، اَنانیت، غصہ، انتقام، تکبر، خود غرضی، بے اعترافی جیسے جذبات کو جگا کر انسان کی انسانیت کو دباتا ہے اور اس کی حیوانیت کو جگا کر اس کو اپنے جیسا بنا دینا چاہتا ہے۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی اسی دوطرفہ تقاضے کے درمیان ہے۔ ہر آدمی ایک داخلی جنگ کے محاذ پر کھڑا ہوا ہے۔ ایک طرف اس کا ضمیر ہے جو اس کو خدا کی طرف کھینچتا ہے۔ دوسری طرف اس کی اَنانیت ہے جو اس کو دھکیل کر شیطان کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ ضمیر خدا کا نمائندہ ہے اور انانیت شیطان کا نمائندہ۔

داعی کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کرے۔ وہ انسان کے اندر ذہنی بیداری لاکر اس کو اس قابل بنائے کہ وہ اس دوطرفہ تقاضے کو پہچانے۔ وہ اپنی انانیت پر روک لگائے اور ضمیر کی آواز کو تقویت دے۔ وہ شیطان کی ترغیبات سے بچ کر خدا کے اس راستہ کا مسافر بن جائے جو اس کو جنت کی طرف لے جانے والا ہے —— یہ دعوتی کام زمین پر ہونے والے تمام کاموں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہ پیغمبروں والا کام ہے۔ جو لوگ اس کام کے لیے اٹھیں انھیں نہایت خصوصی انعامات سے نوازا جائے گا۔

قرآن کی سورۃ نمبر ۷ میں اصحابِ اعراف کا ذکر ہے، یعنی بلندیوں والے، یہ وہ لوگ ہیں جو قیامت کے دن اونچے منبروں پر کھڑے کیے جائیں گے۔ اور اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ دونوں کے بارہ میں خدا کے فیصلہ کا اعلان کریں گے۔ ان آیات کا ترجمہ یہ ہے :

اور اعراف کے اوپر کچھ لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو ان کی علامت سے پہچانیں گے اور وہ جنت والوں کو پکار کر کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو، وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے مگر وہ امیدوار ہوں گے۔ اور جب دوزخ والوں کی طرف ان کی نگاہ پھیری جائے گی تو وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہم کو شامل نہ کرنا ان ظالم لوگوں کے ساتھ۔ اور اعراف والے ان اشخاص کو پکاریں گے جنھیں وہ ان کی علامت سے پہچانتے ہوں گے۔ وہ کہیں گے کہ تمہارے کام نہ آئی تمہاری جماعت اور تمہارا اپنے کو بڑا سمجھنا۔ کیا یہی وہ لوگ ہیں جن کی نسبت تم قسم کھا کر کہتے تھے کہ ان کو کبھی اللہ کی رحمت نہ پہنچے گی۔ جنت

میں داخل ہو جاؤ، اب نہ تم پر کوئی ڈر ہے اور نہ تم غمگین ہو گے (۴۹-۴۶)

اس آیت میں اصحاب اعراف سے مراد شہداء ہیں (تفسیر قرطبی، جلد ۷/۲۱۱) یعنی خدا کے وہ خاص بندے جنھوں نے دنیا میں قوموں کے اوپر خدا کے دین کی گواہی دی اور پھر کسی نے مانا اور کسی نے انکار کیا۔ ان شہداء کے لیے قرآن میں مختلف الفاظ آئے ہیں مثلاً منذر، مبشر، داعی، وغیرہ۔ اس گروہ میں اولاً انبیاء شامل ہیں اور اس کے بعد اللہ کے وہ خاص بندے جنھوں نے انبیاء کے نمونہ کو لے کر اپنے زمانہ کے لوگوں پر دعوت وشہادت کا کام انجام دیا۔

تاہم قیامت میں لوگوں کے ابدی انجام کا جو فیصلہ ہونے والا ہے وہ اسی کارِ شہادت کی بنیاد پر ہو گا جو دنیا میں ان کے اوپر انجام دیا گیا تھا۔ یہ کارِ شہادت دنیا ہی میں انسانوں کو دو گروہوں میں بانٹ رہا ہے۔ ایک اس کو قبول کرنے والے اور دوسرے اس کا انکار کرنے والے۔ قیامت میں یہ دوسرے قسم کے لوگ ایک دوسرے سے الگ کر دیے جائیں گے۔ اور پھر دونوں کے لیے ان کے عمل کے مطابق دو مختلف انجام کا فیصلہ کیا جائے گا۔

یہ فیصلہ اگرچہ تمام تر خدا کا فیصلہ ہو گا۔ تاہم اس فیصلہ کا اعلان انھیں خصوصی بندوں کے ذریعہ کرایا جائے گا جنھوں نے دنیا میں دعوت وشہادت کا کام انجام دیا تھا۔ یہ ان کے حق میں ایک غیر معمولی اعزاز ہو گا۔ اس اعلان کے لیے قیامت کے میدان میں اونچے اونچے اسٹیج بنائے جائیں گے جن کے اوپر یہ اصحاب اعراف کھڑے ہوں گے۔ وہاں سے وہ ہر ایک کو دیکھیں گے اور ہر ایک کے بارہ میں خدائی فیصلہ سے اس کو باخبر کریں گے۔

شہداء اور دعاۃ نے دنیا میں خدا کے کام کو اپنا کام سمجھ کر اس کے لیے محنت کی تھی۔ اس عمل کی بنا پر ان کو یہ امتیازی انعام دیا جائے گا کہ قیامت میں وہ بلندیوں پر کھڑے ہوں اور اس دعوتِ حق کے آخری انجام سے لوگوں کو باخبر کریں۔ دنیا میں وہ اپنے مقصد کے اعتبار سے بلند تھے اور قیامت میں وہ اس کے عملی انجام کے اعتبار سے بلند قرار دیے جائیں گے۔

خدا پر ایمان لانے کے بعد ایک بندہ سے عملی طور پر جو کچھ مطلوب ہے، اس کو قرآن میں

دو قسم کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ـــــ اطاعتِ خدا، اور نصرتِ خدا۔ اطاعتِ خدا سے مراد یہ ہے کہ بندہ ان تمام اوامر و نواہی پر عمل کرے جو خدا کی طرف سے رسول کے ذریعہ بتائے گئے ہیں۔ وہ ان تمام حکموں کو اپنی زندگی میں اختیار کرے جن کو اختیار کرنے کی خدا نے تاکید کی ہے۔ اور ان تمام چیزوں سے بچے جن سے بچنے کا خدا نے اپنی کتاب میں حکم دیا ہے یا اپنے رسول کے ذریعہ جن کا اعلان فرمایا ہے۔

نصرتِ خدا کا مطلب ہے خدا کی مدد کرنا۔ یہ ایک انوکھا شرف ہے جو کسی صاحبِ ایمان آدمی کو ملتا ہے۔ اس سے مراد وہی چیز ہے جس کو قرآن میں دعوت الی اللہ کہا گیا ہے۔ یہ چونکہ خود خدا کا ایک مطلوب عمل ہے جو بندہ کے ذریعہ ادا کرایا جاتا ہے اسی لیے اس کو نصرتِ خدا (خدا کی مدد) سے تعبیر کیا گیا۔

عبادت، اخلاق، معاملات میں خدا کے احکام کی تعمیل بندہ کی اپنی ضرورت ہے۔ اس کے ذریعہ بندہ اپنی بندگی کو ثابت کر کے خدا کے انعام کا مستحق بنتا ہے۔ مگر دعوت الی اللہ کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ قرآن کے مطابق یہ اللہ کے اوپر سے حجت کو اٹھانا ہے (النساء ۱۶۵) امتحان کی مصلحت کی بنا پر یہ کام انسانوں کے ذریعہ ادا کرایا جاتا ہے۔ یہ ایک خدائی عمل ہے جس کو کچھ انسان گویا کہ خدا کی طرف سے انجام دیتے ہیں اور پھر خدا کے یہاں سے اس کی مزدوری پاتے ہیں۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے قرآن کی اس آیت کا مطالعہ کیجئے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنصَارَ اللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ فَآمَنَت طَّائِفَةٌ مِّن بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَفَرَت طَّائِفَةٌ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ (الصف ۱۴)

اے ایمان والو، تم اللہ کے مددگار بنو، جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا، کون اللہ کے واسطے میرا مددگار ہوتا ہے۔ حواریوں نے کہا ہم ہیں اللہ کے مددگار، پس بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ لوگوں نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں مدد کی، پس وہ غالب ہو گئے۔

اس آیت میں اللہ کی نصرت کرنے یا اللہ کا انصار بننے سے کیا مراد ہے۔ اس سے مراد

ہے — خدا کے دعوتی منصوبہ میں اپنے آپ کو قول وعمل سے شریک کرنا۔ اقامت حجت کے خدائی کام کو اپنا کام بنا کر اس کے لیے محنت کرنا۔ مفسر ابن کثیر نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ای من معینی فی الدعوة الی اللہ عزوجل؛ (قال الحواریون) وھم اتباع عیسیٰ علیہ السلام (نحن انصار اللہ) ای نحن انصارك علی ما ارسلت بہ وموازروك علی ذلك ولھذا بعثھم دعاةً الی الناس فی بلاد الشام فی الاسرائیلین والیونانین، وھکذا کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول فی ایام الحج "من رجل یؤوینی حتی ابلغ رسالة ربی فانّ قریشًا قد منعونی ان ابلغ رسالة ربی" (تفسیر ابن کثیر ۴/۳۶۲)

یعنی کون ہے جو اللہ کی طرف بلانے کے کام میں میرا مددگار ہو (حواریین نے کہا) اور اس سے مراد عیسیٰ کے پیرو ہیں (ہم ہیں اللہ کے مددگار) ہم آپ کے مددگار ہیں اس کام میں جس کو لے کر آپ بھیجے گئے ہیں اور اس کام میں ہم آپ کا ساتھ دینے والے ہیں۔ اس لیے حضرت مسیح نے ان کو لوگوں کی طرف داعی بنا کر بھیجا بلاد شام میں اسرائیلیوں اور یونانیوں کی طرف۔ اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایام حج میں لوگوں کے پاس جا کر کہتے تھے تم میں کون شخص ہے جو میری مدد کرے یہاں تک کہ میں اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچا دوں کیونکہ قریش مجھے اپنے رب کا پیغام پہنچانے سے روک رہے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ ساری دنیا کے لیے خدا کے پیغمبر ہیں۔ مگر آپ ایک محدود مدت تک دنیا میں رہے اور اس کے بعد آپؐ کی وفات ہوگئی۔ اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی صورت کیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ آپ کی امت آپ کے بعد اس کام کی ذمہ دار ہے۔ اپنی زندگی میں آپ نے براہِ راست طور پر اس کام کو انجام دیا۔ آپ کے بعد یہ کام بالواسطہ طور پر آپ کی امت کے ذریعہ انجام پائے گا۔ آپ کی امت کی لازمی ذمہ داری ہے کہ وہ نسل در نسل ہر زمانہ کے لوگوں کے سامنے اس دین کا پیغام پہنچاتی رہے جو آپ خدا کی طرف سے لائے اور جو قیامت تک اسی حال میں محفوظ رہے گا۔

اس معاملہ کی مزید تشریح ایک حدیث سے ہوتی ہے جس کو ابن ہشام نے سیرت کے

تحت نقل کیا ہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مسیح کے بارہ میں بھی فرمایا اور خود اپنے بارے میں بھی۔ اس حدیث کا ترجمہ یہ ہے :

مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کے بعد ایک دن اپنے اصحاب کے سامنے آئے۔ آپ نے فرمایا کہ اے لوگو، اللہ نے مجھ کو تمام دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے، پس تم اس معاملہ میں مجھ سے اختلاف نہ کرو جیسا کہ مسیح کے حواریوں نے کیا تھا۔ آپ کے اصحاب نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، حواریوں نے کس طرح اختلاف کیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ مسیح نے اپنے حواریوں کو اس کام کی طرف بلایا جس کی طرف میں نے تم کو بلایا ہے پس مسیح نے جس کو قریبی مقام پر جانے کے لیے کہا وہ راضی رہا اور تیار ہو گیا اور جس کو دور کے مقام پر جانے کے لیے کہا تو اس نے ناگواری ظاہر کی اور وہ جانے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ اس کے بعد مسیح نے اللہ سے اس بات کی شکایت کی تو جو لوگ زبان کے فرق کی وجہ سے جانے کے لیے تیار نہیں ہوئے تھے وہ اس قوم کی زبان بولنے لگے جن کی طرف مسیح ان کو بھیج رہے تھے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو مختلف سرداروں اور حاکموں کی طرف اپنی دعوت کے ساتھ روانہ کیا۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے اصحاب کے سامنے آئے اور اس دعوتی کام کی طرف انھیں توجہ دلائی تو ان سے کہا کہ اللہ نے مجھ کو سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے پس تم میری طرف سے اس ذمہ داری کو ادا کرو اللہ تمہارے اوپر رحم فرمائے (سیرت ابن ہشام، جلد ۴، صفحہ ۲۷۹ ــ ۲۷۸)

زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے کسی انسان کے لیے اس سے بڑا کوئی اعزاز نہیں کہ وہ ایک ایسے کام کے لیے سرگرم ہو جو براہ راست طور پر خود خدا کا کام ہو جو گویا خداوند ذوالجلال کی نیابت ہے۔ یہ بلاشبہ ایک ایسا اعزاز ہے جس سے بڑا کوئی اعزاز ممکن ہی نہیں۔

خدا قادر مطلق ہے۔ وہ ہر معلوم اور نامعلوم کام کو انجام دینے کی مکمل قدرت رکھتا ہے۔ وہ چاہے تو اپنے پیغام رسانی کے لیے پتھروں کو گویا کر دے، وہ درخت کی ہر پتی کو زبان بنا دے جس سے وہ خدا کے پیغامات کا اعلان کرنے لگیں۔ مگر یہ خدا کا طریقہ

نہیں۔ خدا یہ چاہتا ہے کہ انسانوں کے درمیان اس کے پیغام کی پیغام رسانی خود انسان ہی انجام دے تاکہ التباس کا پردہ باقی رہے، تاکہ امتحان کی مصلحت مجروح نہ ہونے پائے۔

دعوت جس کو قرآن میں انذار و تبشیر کہا گیا ہے، وہ براہِ راست خدا کا کام ہے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ حجت خدا پر نہ رہے بلکہ وہ انسانوں کی طرف منتقل ہو جائے۔ مگر امتحان کی مصلحت کا تقاضا ہے کہ یہ کام کسی معجزاتی اسلوب میں انجام نہ پائے بلکہ انسانوں میں سے کوئی انسان اسے انجام دے۔ یہی وجہ ہے جس کی بنا پر اس خدائی کام کو انسانوں کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے۔

اس صورت حال نے انسان کے لیے عظیم ترین عمل کا دروازہ کھول دیا ہے۔ جو لوگ دعوت کے اس خدائی عمل کے لیے اٹھیں ان کو دنیا کی زندگی میں نہایت خصوصی مدد حاصل ہوتی ہے اور آخرت میں ان کو اعلیٰ ترین اعزازات سے نوازا جائے گا۔

ایک بندہ جب نماز پڑھتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کے آگے اپنے عجز کا اقرار کر رہا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جب وہ دعوت الی اللہ کا کام کرتا ہے تو اس کا احساس یہ ہوتا ہے کہ وہ خود خدا کا ایک کام انجام دے رہا ہے۔ کسی بندے کے لیے بلاشبہ اس سے زیادہ لذیذ کوئی تجربہ نہیں کہ وہ محسوس کرے کہ میں اپنے رب کے کام میں مصروف ہوں، میں اپنے رب کے ایک منصوبہ کی تکمیل کر رہا ہوں۔

احکامِ دعوت

انذار و تبشیر

قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— اللہ نے رسولوں کو خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت باقی نہ رہے اور اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے (رُسُلاً مبشّرین و مُنذرین لِئلّا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل۔ وکان اللہ عزیزاً حکیماً) النساء ۱۶۵

اسلام کی دعوت، اپنی حقیقت کے اعتبار سے انذار اور تبشیر ہے۔ یعنی انسان کو اس حقیقتِ واقعہ سے باخبر کرنا کہ تم دنیا میں آزاد نہیں ہو بلکہ تم کو یہاں امتحان کے لیے آباد کیا گیا ہے۔ تم ہر لمحہ خدا کی نگرانی میں ہو۔ ایک مقرر مدت کے بعد خدا تمہارے اوپر موت وارد کر کے اپنے پاس بلائے گا۔ وہاں تمہارے قول اور عمل کا حساب لیا جائے گا۔ خدا کی اس عدالت میں جو غلط کار ٹھہرا اس کے لیے جہنّم ہے اور جو وہاں صالح قرار پایا اس کے لیے ابدی جنّت۔

انسان جب موجودہ دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے ساتھ کوئی گائڈ بک نہیں لاتا۔ پھر انسان کیسے جانے کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے، اس کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ اسلام کی دعوت اسی سوال کا جواب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے آغاز سے لے کر بعد کے زمانہ تک مسلسل پیغمبر بھیجے تاکہ وہ لوگوں کو بتا دیں کہ زندگی کی نوعیت کیا ہے اور موت کے بعد ان کے ساتھ کیا معاملہ پیش آنے والا ہے۔

پیغمبروں کو بھیجنا اور کتاب اتارنا ایک انتہائی غیر معمولی واقعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ غیر معمولی کام اس لیے کیا تاکہ آخرت میں کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ مجھ کو زندگی کی اس نوعیت کا علم ہی نہ تھا۔ اور جب میں اس پورے معاملہ سے بے خبر تھا تو یہ ظلم ہوگا کہ مجھے اس کے لیے پکڑا جائے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں کہ کوئی انسان آخرت میں اس قسم کا عذر پیش کر سکے۔ اسی لیے اس نے پیغمبروں کو مبشّر اور مُنذر بنا کر بھیجا جو پیشگی طور پر انسان کو اس حقیقت سے باخبر کر دیں۔

پیغمبروں کے اس کام کی نوعیت یہ تھی کہ انھوں نے ایک طرف انسان کو ایک خوشخبری

دی کہ اگر تم نے اپنے قول وعمل کو درست رکھا تو تم ابدی طور پر آرام میں رہو گے۔ دوسری طرف انھوں نے لوگوں کو ڈرایا کہ اگر تم نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کیا اور خدا کی مرضی سے منحرف ہو کر زندگی گزاری تو تمہارے لیے جہنم کی آگ کے سوا کوئی اور انجام نہیں۔

اس دعوتی عمل کا نشانہ مخالفین کے اوپر حجت قائم کرنا ہے۔ یعنی لوگوں کے سامنے حق کے پیغام کو مسلسل طور پر پیش کیا جائے۔ تمام نفسیاتی پہلوؤں اور حکیمانہ آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کو آخری حد تک جاری رکھا جائے۔ یہاں تک کہ وہ منزل آجائے جب کہ ماننے والے حق کے پیغام کو مان لیں اور جن کو نہیں ماننا ہے ان کی بے خبری ٹوٹ جائے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جو سرتاسر آخرت پر مبنی ہے۔ اس میں سارا زور اس سنگین مسئلہ پر رہتا ہے جو آخرت کی صورت میں اگلے مرحلۂ حیات میں سامنے آنے والا ہے۔

قرآن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ پس تم جمے رہو جیسا کہ تم کو حکم ہوا ہے۔ اور وہ بھی جنھوں نے تمہارے ساتھ توبہ کی ہے اور حد سے نہ بڑھو بیشک وہ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو۔ اور ان کی طرف نہ جھکو جنھوں نے ظلم کیا۔ ورنہ تم کو آگ پکڑلے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں، پھر تم کہیں مدد نہ پاؤ گے (ھود ۱۱۳-۱۱۲)

اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اور ان کے بعد ان کی نیابت میں داعی کی یہ لازمی ذمہ داری ہے کہ اس کی دعوتی مہم صرف انذار و تبشیر کے واحد نکتہ پر متمرکز رہے۔ کسی بھی حال میں ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ دنیا کے بھٹکے ہوئے لوگ اپنے مفاد کے تحت جو مسائل کھڑے کریں، داعی اس کی طرف جھک جائے، وہ اصل نکتۂ دعوت سے ہٹ کر دوسری چیزوں کو اپنی دعوتی مہم کا نشانہ بنالے۔ جو داعی ایسا کرے وہ اللہ کی نظر میں مجرم قرار پائے گا نہ کہ اللہ کے دین کا داعی۔

انذار و تبشیر یا دعوت الی اللہ کا اصل نشانہ آخرت کا مسئلہ ہے نہ کہ دنیا کا مسئلہ۔ دعوت کی مہم کو مکمل طور پر آخرت رخی ہونا چاہیے۔ کسی ادنیٰ درجہ میں بھی اگر یہ مہم دنیوی مسائل کی طرف مڑ جائے تو اس کے بعد اس کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ اس کا اصل مقصد واضح طور پر صرف اقامتِ حجت ہے نہ کہ کسی اور چیز کی اقامت۔

اسی انذار و تبشیر کا نام دعوت ہے۔

امّت کی ذمہ داری

قرآن کی سورہ نمبر ٦ میں ارشاد ہوا ہے ـــــ تم پوچھو کہ سب سے بڑا گواہ کون ہے۔ کہو اللہ، وہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے اور مجھ پر یہ قرآن اترا ہے تاکہ میں تم کو اس سے خبردار کردوں اور اس کو جسے یہ پہنچے۔ کیا تم اس کی گواہی دیتے ہو کہ خدا کے ساتھ کچھ اور معبود بھی ہیں۔ کہو، میں اس کی گواہی نہیں دیتا۔ کہو، وہ تو بس ایک ہی معبود ہے اور میں بری ہوں تمہارے شرک سے (الانعام ١٩-١٨)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کے لیے نذیر بنا کر بھیجے گئے ہیں (الفرقان ١) اب سوال یہ ہے کہ پیغمبر اسلام خود تو صرف ٦٣ سال تک دنیا میں رہے اور اس کے بعد آپؐ کی وفات ہوگئی۔ ایسی حالت میں بعد کے لوگوں تک آپ کی پیغمبری کس طرح پہنچے گی جبکہ آپ دنیا میں نہ ہوں گے۔ اس کا جواب مذکورہ آیت میں دیا گیا ہے۔

اس آیت میں پیغمبر کی زبان سے یہ کہا گیا ہے کہ "مجھ پر یہ قرآن اترا ہے تاکہ میں تم کو اس سے خبردار کروں اور اس کو جسے یہ پہنچے" (لانذرکم بہ ومن بلغ) پیغمبر اسلامؐ نے اپنے زمانہ کے لوگوں تک براہ راست طور پر خود اپنی کوشش سے قرآن کے پیغام کو پہنچایا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ قرآن کا یہ پیغام بعد کے لوگوں تک کس ذریعہ سے پہنچے گا۔ یہ ذریعہ آپؐ کی امت ہے۔ آپؐ کے بعد آپ کی امت آپ کی نیابت میں پیغام رسانی کا یہ کام انجام دے گی۔ ہر دور کے افرادِ امت اپنے زمانہ کی انسانی نسلوں کے سامنے قرآن کی تبلیغ کا یہ کام انجام دیتے رہیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

قرآن ایک خدائی چیتاونی ہے۔ وہ اس لیے نہیں اتارا گیا کہ ایک عام کتاب کی طرح الماری میں رکھا رہے۔ بلکہ اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس کو ہر زمانہ کے لوگوں تک مسلسل پہنچایا جائے۔ پیغمبر اگر اپنے زمانہ کے لوگوں پر پیغام رسانی کا یہ کام انجام نہ دیتے تو خدا کی نظر میں ان کا پیغمبر ہونا ہی مشتبہ ہوجاتا (المائدہ ٦٧) اسی لیے آپ آخری حد تک اس کے حریص تھے کہ لوگوں تک خدا کی بات پہنچ جائے۔ یہاں تک کہ خود اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ شاید تم اپنے آپ کو ہلاک کرڈالوگے

اس غم میں کہ لوگ ایمان نہیں لاتے (الکہف ۶)

اس سلسلہ میں جو ذمہ داری پیغمبر کی تھی، آپ کے بعد ٹھیک وہی ذمہ داری آپ کی امت کی ہو چکی ہے۔ امت کو وہ ذریعہ یا وسیلہ بننا ہے جس سے کہ قرآن کا پیغام تمام انسانوں تک پہنچ جائے۔ اس معاملہ میں امت، خاص طور پر اس کے علماء کو اس آخری حد تک جا کر یہ ثبوت دینا ہے کہ وہ عام انسانوں کی ہدایت کے حریص بن گئے ہیں۔ انھیں اپنے آپ کو اس کام میں اتنا زیادہ شامل کرنا ہے کہ بظاہر محسوس ہونے لگے کہ شاید وہ اس کوشش میں اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے۔

حدیث (مسند احمد) میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ امت تمام امتوں سے افضل ہے (فُضِّلَتْ هٰذه الامّة على سائر الأمم) امتِ محمدی کی یہ فضیلت کسی پُراسرار سبب سے نہیں ہے اور نہ یہ اس کا کوئی وراثتی حق ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد اس امت کو وہ بھاری ذمہ داری ادا کرنا ہے جو اس سے پہلے خود پیغمبر پر عائد ہوتی تھی۔ پیغمبر کو اس ذمہ داری کے احساس نے بوڑھا کر دیا تھا (شیبتني هود وأخواتها) یہ گراں بار ذمہ داری چوں کہ خصوصی طور پر خاتم النبیین کی امت پر عائد کی گئی ہے اس لیے اس کا درجہ بھی بلند کر دیا گیا۔ کیونکہ یہ اصول ہے کہ جتنی بڑی ذمہ داری اتنا ہی بڑا انعام۔

تبلیغ عام کی یہ ذمہ داری جو امت مسلمہ پر ڈالی گئی ہے اس کی حیثیت اختیاری مضمون کی نہیں ہے کہ چاہے اس کو کیا جائے چاہے اس کو کسی عذر کی بنا پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ ایک ایسی ذمہ داری ہے جس کو ہر حال میں ادا کرنا ہے۔ جس طرح پیغمبر کے لیے اس معاملہ میں کوئی عذر مسموع نہ تھا اسی طرح آپ کی امت کے لیے بھی کوئی عذر مسموع نہیں۔ حتی کہ بظاہر دوسرے دینی اعمال بھی امت کی نجات کے لیے کافی نہیں ہو سکتے، اگر وہ دعوتِ عام کے اس فریضہ کو چھوڑے ہوئے ہو۔

ہزاروں انسان ہر روز مر رہے ہیں۔ اس طرح وہ اس موقع سے محروم ہو رہے ہیں کہ انھیں خدا کی بات بتائی جائے اور وہ اس کو قبول کر کے اپنی عاقبت سنوار سکیں۔ ایسی حالت میں امت مسلمہ کا لازمی فریضہ ہے کہ وہ ہر عذر کو چھوڑ کر اس دعوتی مہم کے لیے اٹھ کھڑی ہو۔

لازمی فریضہ

قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں ارشاد ہوا ہے ——— اے پیغمبر، جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے اس کو پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔ اللہ یقیناً منکر لوگوں کو راہ نہیں دیتا (المائدہ ۶۷)

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کو جس خاص مقصد کے تحت بھیجا وہ یہ تھا کہ خدا سے ملی ہوئی ہدایت کو لوگوں تک پہنچا دے۔ یہی پیغمبر کا اصل کام تھا۔ پیغمبر اگر یہ کام نہ کرے یعنی جو پیغام اسے دوسروں تک پہنچانا ہے وہ اس کو نہ پہنچائے تو گویا کہ اس نے اپنے مشن کی تکمیل نہ کی۔ اور جب پیغمبر اپنے مشن کی تکمیل میں ناکام رہے تو اس کی اصل حیثیت ہی خدا کی نظر میں مشتبہ ہو جائے گی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ پیغمبر کی پیغمبری خدا کی نظر میں اسی وقت متحقق ہوتی ہے جب کہ وہ خدا کے دیے ہوئے دعوتی مشن کی تکمیل کرے۔ بصورتِ دیگر وہ ایک ایسا انسان بن جائے گا جو اپنی حیثیتِ واقعی کو ثابت شدہ بنانے میں ناکام رہا ہو۔

ختمِ نبوت کے بعد امتِ محمدی مقامِ نبوت پر ہے۔ یعنی اس کو وہی کام انجام دینا ہے جو پیغمبر نے اپنے زمانہ میں انجام دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خود پیغمبر کی طرح، امت محمدی کا امتِ محمدی ہونا تمام تر اس پر موقوف ہے کہ وہ پیغمبر کی نیابت میں تبلیغ ما انزل اللہ کا کام کرے۔ وہ ہر زمانہ کے انسانوں تک خدا کے دین کو اس کی بے آمیز صورت میں پہنچاتی رہے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس پر بھی مذکورہ آیت کے الفاظ اسی طرح صادق آئیں گے جس طرح وہ پیغمبر پر صادق آتے۔ یعنی وہ خدا کی نظر میں امتِ محمدی ہونے کی حیثیت کھو دے گی۔

اس معاملہ میں امت کے لیے دعوتی عمل کے تین درجے ہیں۔ امت کے ہر فرد کو اپنی صلاحیت کے اعتبار سے ان میں سے کسی درجہ میں اپنے داعی ہونے کی حیثیت کو ثابت شدہ بنانا ہے۔ جو لوگ اس عمل میں شرکت نہ کریں ان کے دوسرے اعمال خدا کی نظر میں بے قیمت ہو جائیں گے۔ اس معاملہ میں خدا کا جو معیار ہے وہ پیغمبر اور پیغمبر کی امت کے لیے یکساں ہے۔

اس معاملہ کا پہلا درجہ وہ ہے جس کو شریعت میں نیت کہا جاتا ہے۔ یعنی نیت کے اعتبار سے دعوت کے عمل میں شریک ہونا۔ تاہم یہ نیت کسی لفظی تکرار کا نام نہیں، یہ دل کی گہرائیوں کے ساتھ تڑپنے کا نام ہے۔ ہر مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسری قوموں کی ہدایت کا حریص ہو، وہ ان کی گمراہیوں کو دیکھ کر بے چین ہو جائے۔ وہ اپنی تنہائیوں میں ان کی ہدایت کے لیے دعا کرے۔ یہ جذبہ اتنا شدید ہو کہ اس کو سوچتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑیں۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ اہل ایمان شدت کے ساتھ اس کا اہتمام کریں کہ ان کی ذات کسی بھی اعتبار سے دعوت کے راستہ میں رکاوٹ نہ بنے۔ وہ کوئی بھی ایسا عمل نہ کریں جو لوگوں کے دل میں اسلام کے خلاف نفرت اور بیزاری پیدا کر دے۔ وہ ایسے ہر عمل سے مکمل پرہیز کریں جو داعی اور مدعو کے درمیان کشیدگی پیدا کرنے والا ہو۔ وہ ہر حال میں اس کا اہتمام کریں خواہ اس کے لیے انھیں قومی یا اقتصادی یا سیاسی نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔

تیسری چیز براہِ راست دعوت ہے۔ یعنی جن لوگوں کے اندر صلاحیت ہو، وہ تقریر و تحریر کے ذریعہ خدا کے بندوں کو دینِ حق کی طرف بلائیں۔ وہ اپنے پُر تاثیر کلام کے ذریعہ ان کے دل و دماغ کو اس حد تک بدلنے کی کوشش کریں کہ وہ گمراہی کو چھوڑ کر ہدایت کا راستہ اختیار کر لیں۔

"اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا" اس کا مطلب دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ اس معاملہ میں تمھیں کسی بھی عذر کو عذر نہیں بنانا ہے۔ اس معاملہ میں تمہارا ہر عذر اللہ کے یہاں غیر مقبول ہے۔ تم کو صرف یہ کرنا ہے کہ ہر ممکن یا غیر ممکن عذر کو خدا کے خانہ میں ڈال دو اور دعوت کے عمل میں اپنے آپ کو لگا دو۔ اس معاملہ میں دوسرا کوئی بھی راستہ اہلِ ایمان کے لیے جائز نہیں۔

شریعتِ الٰہی کا یہ اصول ہے کہ آدمی سے اتنی ہی پکڑ کی جاتی ہے جتنا اس کے بس میں ہو۔ یہی معاملہ دعوت کا بھی ہے۔ جس آدمی کے پاس جو صلاحیت ہے اسی کے اعتبار سے اسے اپنی ذمہ داری ادا کرنا ہے۔ حتی کہ اگر کسی کے اندر کوئی صلاحیت نہیں تو وہ دل سے اس کے لیے دعا کرے۔

خوشخبری دینے والے

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کچھ اصحاب کو دعوتی مہم پر روانہ کیا۔ اس وقت ان سے نصیحت کرتے ہوئے آپ نے کہا: یسروا ولا تعسروا بشروا ولا تنفروا (تم لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرو تم انھیں مشکل میں نہ ڈالو، تم ان کو خوش خبری دو، تم انھیں متنفر نہ کرو)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم لوگوں کو حق کی طرف بلاؤ تو تمہارا بلانا بیدردانہ نہ ہو بلکہ ہمدردانہ ہو۔ تم کو چاہیے کہ تم انھیں ایسے انداز اور ایسے اسلوب سے بلاؤ کہ اس کو قبول کرنا ان کے لیے ایک آسان چیز معلوم ہو نہ کہ مشکل چیز۔

اسی طرح "خوش خبری دو انھیں متنفر نہ کرو" کا مطلب یہ ہے کہ جب تم لوگوں کو حق کا پیغام دو تو ایسا نہ ہو کہ وہ اس میں اپنے جذبات کی رعایت نہ پاکر اس سے بددل ہوجائیں۔ بلکہ ایسا ہونا چاہیے کہ وہ انھیں ایک پسندیدہ بات نظر آئے۔ وہ پرشوق طور پر اس کی طرف دوڑ پڑیں۔

دعوت کا عمل دوطرفہ عمل ہے۔ ایک طرف داعی ہوتا ہے اور دوسری طرف مدعو۔ داعی کا مزاج اس کا ذوق یا اس کا رہن سہن، ایک انداز کا ہوتا ہے اور مدعو کا مزاج اور ذوق دوسرے انداز کا۔ اب اگر داعی کا یہ حال ہو کہ وہ زبان سے تو دعوت کے الفاظ بولے مگر عملی اعتبار سے وہ مکمل طور پر اپنے ذوق اور عادات میں گھرا ہوا ہو تو وہ مدعو کو بہت کم متاثر کر سکے گا۔ مدعو کی نظر میں اس کا پیغام ایک مشکل پیغام ہوگا اور اس کی بات ایک غیر متعلق بات۔

سچا داعی وہ ہے جو دعوت دیتے ہوئے اپنے آپ کو مدعو کے مقام پر کھڑا کرے۔ وہ بات تو وہی کہے جو حق ہو مگر وہ کامل طور پر مدعو کی رعایت کر رہا ہو۔ مدعو کو آخری حد تک وہ اپنے قریب دکھائی دینے لگے۔

مدعو اگر کیچڑ میں پڑا ہوا ہو اور داعی چاہے کہ اس کے کیچڑ کی کوئی چھینٹ اس کے

کپڑے پر نہ پڑے تو وہ مدعو کے اوپر دعوت کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ داعی کو مدعو کے قریب جانا پڑے گا خواہ اس کے کیچڑ کے چھینٹے اس کے کپڑے پر کیوں نہ آجائیں۔ داعی کو مدعو کے ساتھ شریکِ صحبت ہونا پڑے گا خواہ مدعو کے غلط ماحول کا کچھ غبار داعی کے چہرہ تک کیوں نہ پہنچ جائے۔

دعوت کا عمل کوئی مشینی اعلان نہیں، یہ سراپا شفقت اور محبت کا عمل ہے۔ داعی ہر لمحہ یہ سوچتا ہے کہ وہ مدعو سے کس طرح قربت حاصل کرے۔ داعی کو چاہیے کہ وہ اپنی شخصیت کو مدعو کے لیے ایک مانوس شخصیت بنائے۔ اس کا پیغام مدعو کے لیے ایک قابل لحاظ پیغام بن جائے۔ دعوت کا عمل داعی اور مدعو کے درمیان قربت چاہتا ہے۔ اس قربت کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ داعی کا پیغام مدعو کے دل میں اترے اور اس کا ذہن اس کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔

یہ ایک بے حد نازک عمل ہے۔ مدعو کو مشکل سے بچانے کے لیے داعی کو خود اپنے آپ کو مشکل میں ڈالنا ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے داعی کو مستقبل بیں بننا پڑتا ہے۔ وہ مدعو کی ناپسندیدہ باتوں کو گوارا کرتا ہے اس امید میں کہ آئندہ ان کی اصلاح ممکن ہو سکے گی۔ مدعو کو اپنی طرف لانے کے لیے خود اپنے آپ کو وہ مدعو کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے بغیر دعوت کا موثر ہونا ممکن نہیں۔

"یسروا ولا تعسروا بشروا ولا تنفروا" کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ داعی کو چاہیے کہ دعوت کے عمل میں وہ اپنی رعایت نہ کرے بلکہ مدعو کی رعایت کرے۔ وہ اپنے جذبات کو نہ دیکھے بلکہ مدعو کے جذبات کو دیکھے۔

دعوت کا عمل دو آدمیوں کے درمیان ہونے والا عمل ہے، داعی اور مدعو۔ داعی اگر اپنی ذات کو اوّل سمجھے اور مدعو کو ثانوی حیثیت پر رکھے تو دعوت کا عمل کبھی موثر طور پر جاری نہیں ہو سکتا۔ داعی کو چاہیے کہ عملاً وہ مدعو کو اول حیثیت دے اور اپنے آپ کو ثانوی درجہ پر رکھے۔ اسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ دعوت صحیح طور پر شروع ہو اور پھر وہ اپنی آخری تکمیل تک پہنچے۔

خدا کی گواہی

قرآن میں اہلِ اسلام کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ —— اور اس طرح ہم نے تم کو بیچ کی امت بنا دیا تاکہ تم لوگوں کے اوپر گواہ بنو اور رسولؐ تمہارے اوپر گواہ ہو۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کے اہلِ اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ : (انتم شهداء الله فی الارض (فتح الباری ۲۰۰/۳) یعنی تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ : (المومنون شهداء الله فی الارض (فتح الباری ۲۹۹/۵) یعنی اہلِ ایمان زمین میں اللہ کے گواہ ہیں۔

دعوت الی اللہ کا کام قدیم زمانہ میں پیغمبر کیا کرتے تھے۔ گویا کہ اس زمانہ میں خدا اور بندوں کے درمیان وسَط (بیچ) کی حیثیت پیغمبروں کو حاصل تھی وہ خدا سے لیتے تھے اور بندوں تک پہنچاتے تھے۔ ہدایت کا یہ نظام ہزاروں سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپ کے بعد پیغمبروں کے ذریعہ ہدایت پہنچانے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

تاہم جہاں تک دعوت و تبلیغ کا تعلق ہے، اس کی ضرورت نبوت کا سلسلہ ختم ہونے کے باوجود بدستور باقی ہے۔ بے شمار انسان نسل در نسل پیدا ہو رہے ہیں اور مر رہے ہیں اس لیے ضرورت ہے کہ ان بعد کی نسلوں کو زندگی کی حقیقت بتائی جائے اور انھیں خدا کے احکام سے باخبر کیا جائے۔ بعد کے زمانہ میں پیغام رسانی کا یہ کام امتِ مسلمہ کو انجام دینا ہے۔ ختمِ نبوت کے بعد یہ امت مقامِ نبوت پر ہے۔ اب خدا اور بندوں کے درمیان وسَط (بیچ) کی حیثیت امتِ مسلمہ کو حاصل ہو گئی ہے جو کہ اس سے پہلے پیغمبروں کو حاصل ہوا کرتی تھی۔

یہ کوئی فضیلت نہیں بلکہ ذمہ داری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ اسلام کو چاہیے کہ وہ اپنی ملّی پالیسی میں دعوت کے کام کو اہم ترین مقام دیں۔ ان کی ملّی منصوبہ بندی مکمل طور پر دعوت رخی ہو، وہ اسی کام کے لیے سب سے زیادہ فکرمند ہوں۔ وہ ہر دوسرے

کام کا نقصان برداشت کریں مگر دعوت کا نقصان برداشت نہ کریں ۔ ان کی زندگی میں دعوت کو مقصد کا درجہ حاصل ہو اور دوسری چیزوں کو ضرورت کا۔

حجۃ الوداع کا واقعہ پیغمبر اسلامؐ کے آخری زمانہ میں پیش آیا۔ اس موقع پر آپ نے جو خطبہ دیا اس میں اسلام کی تمام بنیادی تعلیمات کا ذکر تھا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اس مقام پر شاید میں دوبارہ تم سے نہ ملوں ۔ آخر میں آپ نے اپنے اصحاب کو یہ ہدایت دی کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ میرا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں (لیبلغ الشاھد الغائب) فتح الباری ۱/۱۹۰

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت یہ بات اپنے اصحاب سے فرمائی تھی۔ یہ اصحاب اس وقت گویا پوری امت کے نمائندہ تھے۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت قیامت تک پوری امت مسلمہ کے لیے ہے۔ ہر دور کے اہل اسلام کو یہ کرنا ہے کہ پیغمبر سے ملی ہوئی بات کو مسلسل اپنے زمانہ کے لوگوں تک پہنچاتے رہیں یہی تبلیغ امت کی منصبی ذمہ داری ہے۔ اسی کی ادائیگی پر اس امت کے لیے تمام سرفرازیوں کا وعدہ ہے۔

مذکورہ آیت میں شھداء سے مراد دُعاۃ ہیں، (انتم شھداء اللّٰہ فی الارض کا مطلب ہے انتم دعاۃ اللّٰہ فی الارض۔ یعنی تم زمین میں اللہ کے داعی ہو۔ ہماری واحد حیثیت یہ ہے کہ ہمیں اللہ کے بندوں تک وہ پیغام آخری حد تک پہنچا دینا ہے جو اس نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ ہمیں دیا ہے۔

اصحاب رسولؐ نے اس ہدایت کو مکمل طور پر پکڑ لیا چنانچہ آج مکہ اور مدینہ میں صحابہ کی قبریں بہت کم ہیں۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد یہ لوگ مختلف ملکوں میں پھیل گئے اور لوگوں کے درمیان دعوت و تبلیغ کا کام کرنے لگے۔ انہی قوموں کے درمیان ان کی وفات ہوئی اور وہیں ان کی قبریں بنیں۔

اصحاب رسول کا یہ طریقہ قیامت تک آنے والے اہل اسلام کے لیے ایک ابدی نمونہ ہے۔ انھیں صحابہ کی مانند اس کام کو دوبارہ تمام دنیا کی قوموں کے اوپر انجام دینا ہے۔ اس حکم پر عمل کرنے کا انعام بہت بڑا ہے اور اسی کے ساتھ اس کو چھوڑنے کی سزا بھی بہت زیادہ۔

شہادت یا دعوت کا یہ کام اصلاً قول کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ تاہم قول سے مراد محض زبان سے نکلے ہوئے الفاظ نہیں بلکہ وہ الفاظ ہیں جن میں درد اور خیر خواہی نے لفظوں کی صورت اختیار کر لی ہو۔

کلمۂ توحید

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلامی کا کام اس طرح کیا کہ آپ عرب کی مجلسوں میں جاتے اور وہاں لوگوں سے کہتے کہ : ایھا الناس قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا (اے لوگو، کہو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، تم فلاح پاؤ گے)

اس سے معلوم ہوا کہ دعوتِ اسلام کا بنیادی نکتہ توحید ہے۔ داعی کو جس حقیقت کی طرف لوگوں کو بلانا ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کا خدا صرف ایک خدا ہے۔ وہی اکیلا معبود ہے، اس کے سوا کسی اور کو معبودیت کا درجہ حاصل نہیں۔ یہی دعوت اسلامی کی اصل ہے۔ وہ تمام چیزیں اسی اصل کے تقاضے ہیں جن کو دین اور شریعت کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آدمی کے ذہن و دماغ میں اگر خدا کی وحدانیت کا تصور پوری طرح بیٹھ جائے تو بقیہ تمام مطلوب چیزیں اپنے آپ زندگی میں پیدا ہو جائیں گی۔

اسی عقیدہ کا نام توحید ہے اور بلاشبہہ توحید سب سے بڑا انقلابی عقیدہ ہے۔ توحید کا عقیدہ انسان کو اس کی اصل حیثیت یاد دلاتا ہے۔ وہ اس کو بتاتا ہے کہ خدا خالق ہے اور وہ اس کا مخلوق، خدا حاکم ہے اور وہ اس کا محکوم، خدا دینے والا ہے اور وہ اس سے پانے والا، خدا حساب لینے والا ہے اور وہ اس کے زیرِ حساب ہے۔ خدا کی پکڑ سے بچنا کسی بھی حال میں اس کے لیے ممکن نہیں۔

یہ عقیدہ آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ خدا کے پیغمبر کو اپنا رہنما بنائے۔ وہ خواہش پرستی کے بجائے خدا پرستی کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ دنیوی رونقوں سے اوپر اٹھ کر آخرت کو اپنا مرکزِ توجہ بنائے۔ وہ اپنی زندگی کو خدا کی ماتحتی میں گزارے تاکہ وہ اس کی سزا سے بچ سکے اور اس کے انعام کا مستحق قرار پائے۔

توحید کا عقیدہ کیرم بورڈ گیم کی اصطلاح میں ماسٹر اسٹروک کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ آدمی کو اندر سے لے کر باہر تک ہلا دیتا ہے، وہ آدمی کی پوری شخصیت کو جھنجوڑ دیتا ہے۔

عقیدہ توحید کی اسی اہمیت کی بنا پر حق کا داعی اس کو اپنی دعوتی مہم کا مرکزی نکتہ بناتا

ہے۔ وہ اپنی ساری کوشش اس پر صرف کرتا ہے کہ ہر ہر فرد کے اندر اس عقیدہ کو داخل کردے۔ وہ ہر آدمی کے اندر خدائے واحد کا زندہ یقین پیدا کردے۔

ماحول میں ہمیشہ طرح طرح کے مسائل اٹھتے ہیں۔ لوگ مختلف قسم کی مادی اور سیاسی نزاعات میں الجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں ہر وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ داعی ماحول سے متاثر ہو کر دوسری آوازیں بولنے لگے یا مشکلات و مسائل کے حل کے نام پر وہ اپنی کوششوں کو جزئی یا کلی طور پر کسی اور طرف موڑ دے۔ مگر دعوت کی شریعت میں اس قسم کا انحراف قطعاً جائز نہیں۔

داعی کو چاہیے کہ وہ اس معاملہ میں حد درجہ محتاط ہو، وہ کسی بھی عذر کی بنا پر اپنی مہم کو نکتۂ توحید سے ہٹنے نہ دے۔ وہ اپنے اندر اٹھنے والے نفسیاتی جھٹکوں کو برداشت کرے۔ وہ ہر قسم کے نقصان کو گوارا کرتے ہوئے اپنی دعوت کو اس کے مرکزی نکتہ پر برقرار رکھے۔

داعی کی یہ دعوتی مہم اس یقین پر کھڑی ہوتی ہے کہ انسان کی فلاح تمام تر اسی عقیدۂ توحید سے وابستہ ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ یہ عقیدہ آدمی کے اندر حقیقت پسندی پیدا کرتا ہے۔ اس کے اندر مثبت فکر کو فروغ دیتا ہے۔ اس کے اندر فطرت شناسی کا مادہ پیدا کرتا ہے۔ اس کو اپنی سوچ اور اپنے جذبہ کے اعتبار سے اس قابل بناتا ہے کہ وہ اعلیٰ افکار میں جیے اور لوگوں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے وہی کرے جو اس کو کرنا چاہیے اور وہ نہ کرے جو اس کو نہیں کرنا چاہیے۔ اور جس آدمی کے اندر یہ صفات پیدا ہو جائیں اس کی کامیابی کو اس دنیا میں کوئی بھی چیز روکنے والی نہیں۔

یہی معاملہ آخرت کا ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کو بتاتا ہے کہ موت کے بعد اس کو مالکِ کائنات کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ اس طرح یہ عقیدہ ہر آدمی کے اندر ایک ایسا داخلی محرک بن جاتا ہے جو اس کو ہر حال میں صحیح روش پر قائم رکھے اور آخرت کے دن اس کی نجات کا ضامن بن جائے۔

توحید کی اسی اہمیت کی بنا پر داعی اس کی تبلیغ کو اپنا نشانہ بناتا ہے۔ وہ کسی بھی سبب کی بنا پر اس سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

جہاد کبیر

قرآن کی سورہ نمبر ۲۵ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ —— پس تم انکار کرنے والوں کی بات نہ مانو اور قرآن کے ذریعہ ان کے ساتھ جہاد کبیر کرو (فَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَجَاھِدْھُمْ بِہٖ جِھَادًا کَبِیْرًا) الفرقان ۵۲

اس آیت میں اہلِ اسلام کو جہاد بالقرآن کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کہیں یہ نہیں فرمایا کہ جاھدوا بالسیف (تلوار سے جہاد کرو) اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کا جہاد ایک پُر امن جدوجہد کا نام ہے۔ کسی بھی درجہ میں وہ کوئی پُر تشدد جدوجہد نہیں۔ جہاد کے لفظی معنی کوشش کے ہیں۔ شریعت میں بھی یہ لفظ پر امن کوشش ہی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ جنگ کے لیے شریعت میں قتال کا لفظ ہے نہ کہ جہاد کا لفظ۔

قرآن کے ذریعہ جہاد کو جہاد کبیر کہنا ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظریاتی جدوجہد متشددانہ جدوجہد کے مقابلہ میں زیادہ عظیم اور زیادہ موثر ہے۔ زیادہ بڑے نتائج ہمیشہ پر امن فکری جدوجہد کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں نہ کہ جنگ و قتال کے ذریعہ۔

قرآن کے ذریعہ جہاد کبیر کا مطلب دعوتی جدوجہد ہے۔ یعنی اسلام کو لوگوں کے سامنے اس کی اصولی حیثیت میں پیش کرنا۔ اسلام کے عقائد کو دلائل و حقائق کے ذریعہ واضح کرنا۔ اسلامی زندگی اور اسلامی کردار کی اہمیت کو حکمت کے ساتھ لوگوں کے لیے قابلِ فہم بنانا۔

قرآن میں خدا کا دین اپنی اصل صورت میں محفوظ ہے۔ اس لیے دعوت کا سب سے موثر ذریعہ یہی ہے کہ قرآن کی زبان میں اس کو لوگوں تک پہنچایا جائے اور اس کو عظیم ترین جدوجہد کے ذریعہ کامیاب بنایا جائے۔

"منکروں کی اطاعت نہ کرو اور قرآن کے ذریعہ ان سے جہاد کبیر کرو" کا مطلب یہ ہے کہ اہل انکار کی روش کے ردعمل میں اپنی روش کا فیصلہ نہ کرو۔ یعنی اگر وہ تمہارے مقابلہ میں تشدد کا طریقہ اختیار کر رہے ہیں تو تم جوابی تشدد شروع نہ کرو بلکہ تم قرآن کو اپنی ڈھال

بناؤ۔ تم ہر حال میں قرآن کی تبلیغ پر جمے رہو۔

اہلِ باطل کے مقابلہ میں اہلِ حق کی سب سے زیادہ موثر کوشش بلاشبہہ وہی ہے جو فکری اور نظریاتی بنیاد پر چلائی جائے۔ باطل اپنے آپ میں کمزور ہے اور حق اپنے آپ میں طاقت ور۔ اس لیے جب دونوں کا براہِ راست مقابلہ ہو تو لازماً یہی ہوگا کہ باطل کو شکست ہو جائے اور حق کو فتح حاصل ہو۔

بے خدا فکر کا مقابلہ جب باخدا فکر سے ہو تو کسی مادی طاقت کے استعمال کے بغیر ایسا ہوگا کہ حق باطل کے اوپر چھا جائے گا۔ اسی طرح شرک کے عقیدہ کے مقابلہ میں توحید کا عقیدہ اپنے آپ فاتحانہ تاثیر رکھتا ہے۔ بے اصول زندگی کے مقابلہ میں بااصول زندگی خود اپنی کشش سے لوگوں کو مسخر کر لیتی ہے۔ یہی حال اسلام کے تمام عقائد اور تعلیمات کا ہے۔ وہ اپنی ذات میں برتری کی صفت رکھتے ہیں۔ جب بھی اسلام کے عقائد و تعلیمات کو بے آمیز صورت میں سامنے لایا جائے گا تو یقیناً وہ اپنے حریف کے اوپر غلبہ حاصل کرے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور غیر اسلام کا مقابلہ ایک غیر مساوی مقابلہ ہے۔ اسلام اور غیرِ اسلام میں جو فرق ہے وہ حق اور باطل کا فرق ہے۔ اور جہاں دو فریقوں کے مقابلہ میں حق اور باطل کا فرق پایا جاتا ہو وہاں پیشگی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کامیابی صرف حق کے لیے مقدر ہے نہ کہ باطل کے لیے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے ذریعہ جہاد، بالفاظ دیگر، پُرامن دعوتی جدوجہد ہی اصل جہاد ہے۔ بلکہ یہی سب سے بڑا جہاد ہے۔ منکر لوگ اگر یہ کوشش کریں کہ اہل ایمان کو دعوت کے میدان سے ہٹا کر دوسرے میدان میں الجھائیں تب بھی اہل ایمان کی ساری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنے عمل کو فکری دعوت کے میدان میں مرتکز رکھیں۔ اور اگر مخالفین کے ہنگاموں کی وجہ سے کسی وقت عمل کا میدان بدلتا ہوا نظر آئے تو ہر ممکن تدبیر کر کے دوبارہ اس کو دعوت کے میدان میں لے آئیں۔

فریق ثانی اگر مناظرہ برپا کرنا چاہے تو داعی کو چاہیے کہ وہ اہتمام کر کے بحث و گفتگو کو غیر مناظرانہ اسلوب پر باقی رکھے۔

حکمتِ دعوت

قرآن کی سورہ نمبر ۴۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ —— اور اس سے بہتر کس کی بات ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوں، اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔ اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔ اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو بڑا نصیبے والا ہے (حم السجدہ ۳۵-۳۳)

دعوت بلاشبہ بہترین قول ہے۔ یہ اس بہتر بات کی تلقین ہے جس سے زیادہ بہتر بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اس سے زیادہ بہتر مشن اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص خدا کے بندوں کو خدا کی طرف بلائے۔ وہ لوگوں کے لیے ان کی ابدی کامیابی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرے۔

مگر تاریخ بتاتی ہے کہ یہ سب سے بہتر قول جب بھی پیش کیا گیا تو ہمیشہ اس کی مخالفت کی گئی۔ اس کے علم برداروں کو طرح طرح سے ستایا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر صحیح بات لوگوں کی خواہشوں سے ٹکراتی ہے۔ ہر صحیح بات یہ تقاضا کرتی ہے کہ اپنی زندگی کو بااصول بنیادوں پر قائم کیا جائے اور بے اصولی اور غیر ذمہ داری کا طریقہ چھوڑ دیا جائے۔ اس طرح حق کی دعوت لوگوں کی خواہشوں سے ٹکرا جاتی ہے۔ لوگ اس کی مخالفت کرنے لگتے ہیں۔

ایسی حالت میں کسی سماج میں دعوت الی اللہ کا اٹھنا ایک طرف سماج کے لیے آزمائش ہے اور دوسری طرف خود داعی کے لیے بھی آزمائش۔ سماج کے لیے آزمائش وہ اس اعتبار سے ہے کہ جب اس کی خواہشوں پر زد پڑے تو وہ خواہشوں کی پیروی چھوڑ کر حق کی پیروی اختیار کرنے پر راضی ہو جائے۔ اور داعی کی آزمائش یہ ہے کہ جب مخالفت کرنے والے اس کی مخالفت کریں تو وہ ردعمل کی نفسیات میں مبتلا نہ ہو۔ وہ اس کے مقابلہ میں صبر و حکمت کا طریقہ اختیار کرے۔

یہ داعی کے لیے بے حد سخت امتحان ہوتا ہے۔ اس کا مقابلہ صرف غیر معمولی صبر سے

کیا جا سکتا ہے۔ یعنی مخاطب کی تلخ باتوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کرنا۔ مخاطب کی زیادتیوں کے باوجود اس کے ساتھ ہمدردی کا تعلق باقی رکھنا۔ مخاطب کی دشمنی کے باوجود اس سے متنفر نہ ہونا۔ اسی کا نام صبر ہے اور صبر کے بغیر دعوت کا کام کرنا ممکن ہی نہیں۔

منفی ردعمل اور مثبت ردعمل دونوں کا انجام یکساں نہیں ہوتا۔ داعی اگر مخاطب کی اشتعال انگیزی کے بعد خود بھی مشتعل ہو جائے تو اس کے بعد دعوت کا کام عملاً ختم ہو جائے گا۔ داعی کا جوابی اشتعال دوبارہ مخاطب کے اشتعال کو بڑھائے گا۔ اس طرح داعی اور مخاطب کے درمیان جو فضا بنے گی وہ دعوتی عمل کی قاتل ہوگی۔ ایسی حالت میں وہاں نہ کوئی کہنے والا ہوگا جو کہے اور نہ کوئی سننے والا ہوگا جو سنے۔

اس کا واحد حل صبر و اعراض ہے۔ داعی اگر صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کرے تو وہ تلخیوں کو گھٹائے گا وہ اس معتدل فضا کو باقی رکھے گا جس میں دعوتی عمل جاری ہوتا ہے اور اپنی فطری رفتار سے سفر کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اپنی آخری منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

یہ صبر بے حد مشکل کام ہے۔ یہ تمام قربانیوں میں سب سے زیادہ بڑی قربانی ہے۔ اس صبر پر قائم رہنے کے لیے بہت زیادہ اولوالعزمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ صرف بلند فطرت لوگ ہی اس صبر پر قائم رہ سکتے ہیں۔ اس صبر کے بغیر دعوت و تبلیغ کا کام بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ صبر سب سے بڑا عمل ہے۔ وہ تمام عبادتوں میں سب سے بڑی عبادت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخرت میں ان صبر کرنے والوں کو بلا حساب اجر دیا جائے گا (سورۃ الزمر ۱۰)

دعوت کے مخاطبین کی طرف سے پیش آنے والی زیادتیوں پر صبر کا یہ اعلیٰ انعام داعی کو آخرت میں ملے گا۔ مگر اس کا ایک اور انعام ہے اور وہ اسی دنیا میں دے دیا جاتا ہے۔ قرآن کے لفظوں میں وہ دشمن کا دوست بن جانا ہے۔ دعوت کا خطاب براہِ راست انسانی فطرت سے ہوتا ہے۔ دعوت جس حق کو پیش کرنے کے لیے اٹھتی ہے وہ ہر آدمی کے دل کی اپنی آواز ہے۔ ایسی حالت میں فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ مخاطب دعوت کے پیغام کو خود اپنی چیز سمجھے اور بلا رکاوٹ اس کو قبول کر لے۔ صبر کی ضرورت اس لیے ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل فضا باقی رہے، انتہائی ناموافق حالات میں بھی وہ بگڑنے نہ پائے۔

صبر اور دعوت

قرآن کی سورہ نمبر ۱۶ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے — اور صبر کرو اور تمہارا صبر خدا ہی کی توفیق سے ہے اور تم ان پر غم نہ کرو اور جو کچھ تدبیریں وہ کر رہے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہو (النحل ۱۲۷)

یہ داعی کے لیے خدا کی ہدایت ہے۔ داعی کو مدعو کی طرف سے جو مخالفانہ احوال پیش آتے ہیں، اس میں داعی کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ خدا کی خاطر اس پر صبر کرے۔ گویا صبر یہ ہے کہ ایک معاملہ جو انسان کی طرف سے پیش آیا ہے، اس کو خدا کے حوالے کر دیا جائے۔ خود کوئی کارروائی کرنے کے بجائے خدا سے یہ امید کی جائے کہ وہ زیادہ بہتر طور پر اس مسئلہ میں داعی کا بدل بن جائے گا۔

دنیا میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کی نگاہیں انسانوں میں اٹکی ہوئی ہوں، جن کو بس انسانوں کی کارروائیاں دکھائی دیتی ہوں۔ دوسرے وہ لوگ جن کی نگاہیں خدا میں اٹکی ہوئی ہوں، جو خدا کی طاقتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ پہلی قسم کے لوگ کبھی صبر پر قادر نہیں ہو سکتے۔ یہ صرف دوسری قسم کے انسان ہیں جن کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ شکایتوں اور تلخیوں کو سہہ لیں۔ اور جو کچھ خدا کی طرف سے ملنے والا ہے اس کی خاطر اس کو نظر انداز کر دیں، جو انسان کی طرف سے مل رہا ہے۔

داعی کو جس طرح جوابی نفسیات سے پرہیز کرنا ہے اسی طرح اس کو جوابی کارروائی سے بھی اپنے آپ کو بچانا ہے۔ مخالفین کی سازشیں اور تدبیریں بظاہر ڈراتی ہیں کہ کہیں وہ دعوت کو تہس نہس نہ کر ڈالیں۔ مگر داعی کو ہر حال میں خدا پر بھروسہ رکھنا ہے۔ اس کو یہ یقین رکھنا ہے کہ خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے اور وہ یقیناً دعوتِ حق کا ساتھ دے کر باطل پرستوں کو ناکام بنا دے گا۔

قرآن میں کہا گیا ہے کہ تم دعوتی کام کرو اور اللہ ضرور تم کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا (المائدہ ۶۷) گویا کہ داعی کا کام دعوتی عمل کو جاری رکھنا ہے۔ اس کے بعد

مختلف اسباب سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں وہ خدا کا معاملہ ہے۔ اور خدا ہی اس کو بہتر طور پر انجام دے گا۔

صبر دعوتی عمل کے لیے اتنا زیادہ ضروری ہے کہ صبر کے بغیر اس کا وجود ممکن ہی نہیں۔ داعی جتنا زیادہ صبر کا ثبوت دے گا اتنا ہی زیادہ وہ اپنی دعوتی ذمہ داری کو ادا کرنے میں کامیاب رہے گا۔

دعوت ایک نازک عمل ہے جس کے ذریعہ انسان کو بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انسان کا معاملہ پتھر جیسا نہیں ہے۔ پتھر کو بدلنے یا گھڑنے کی کوشش کی جائے تو وہ کوئی ردعمل نہیں دکھائے گا۔ وہ تبدیلی کے ہر عمل کو خاموشی کے ساتھ قبول کرتا چلا جائے گا۔ انسان ایک زندہ وجود ہے۔ اس کے اندر مختلف قسم کے جذبات ہیں اس لیے انسان کا بدلنا صرف اس وقت ممکن ہے جبکہ وہ خود بھی اپنے آپ کو بدلنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اس کے بغیر انسان کے اندر تبدیلی لانا ممکن نہیں۔

یہی چیز دعوت کے عمل کے لیے صبر کو ضروری قرار دے دیتی ہے۔ انسان کے اوپر جب دعوت کا عمل کیا جائے تو اکثر اوقات وہ اس کے خلاف بھڑک اٹھتا ہے۔ ایسے موقع پر داعی کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ مدعو کے جذبات کو ابھرنے سے بچانے کے لیے وہ اپنے جذبات کو دبائے۔ مدعو کی طرف سے پیش آنے والے تیز و تند ردعمل پر صبر کرتے ہوئے ٹھنڈے انداز میں اپنے دعوتی عمل کو جاری رکھے۔

مدعو کی اشتعال انگیزی کے باوجود داعی کو معتدل حالت پر رہنا پڑتا ہے۔ مدعو کی شدت کے باوجود ضروری ہوتا ہے کہ داعی اپنے نرم رویہ کو نہ چھوڑے۔ مدعو کی طرف سے پیش آنے والے ناقابل برداشت رویہ کے باوجود اپنے آپ کو نرمی اور اعتدال کی حالت پر قائم رکھے۔

داعی جب صبر کا انداز اختیار کرے تو وہ مدعو کے اندر احتساب کی نفسیات کو جگا دیتا ہے۔ داعی کا یک طرفہ صبر اس کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ دعوت کے فطری اسلوب سے نہ ہٹے۔ صبر داعی کے دعوتی عمل کو آخری حد تک موثر بنا دیتا ہے۔

داعی، مدعو

قرآن کی سورہ نمبر ۸۵ میں ارشاد ہوا ہے —— قسم ہے بُرجوں والے آسمان کی اور وعدہ والے دن کی، اور شاھد کی اور مشہود کی (البروج ۳-۱)

کائنات کی تخلیق ایسے ڈھنگ پر ہوئی ہے جو بتاتی ہے کہ اُس کا وجود ہرگز بے معنی نہیں ہو سکتا۔ کائنات اپنے تمام اجزاء کے ساتھ پکار رہی ہے کہ اس کی تخلیق ایک مقصد کے تحت ہوئی ہے اور لازم ہے کہ وہ دن آئے جبکہ اس مقصد کی تکمیل ہو۔ کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک بامعنی کائنات ہے اور کوئی بامعنی وجود کبھی بے معنی انجام پر ختم نہیں ہو سکتا۔

الیوم الموعود وہی دن ہے جب کہ اس انجام کا ظہور ہو گا۔ اس دن تمام پیدا ہونے والے انسان اللہ کے سامنے اکٹھا کیے جائیں گے۔ اللہ ان سب کا مکمل حساب لے گا۔ اس حساب کے بعد جو شخص اپنے اعمال کے اعتبار سے جیسا ثابت ہو گا ویسا ہی انجام اس کے حصہ میں آئے گا۔ برے کردار والے لوگ جہنم میں داخل کیے جائیں گے اور اچھے کردار والے لوگ جنت میں۔

انسانوں کی قسمت کا یہ فیصلہ جس خاص بنیاد پر کیا جائے گا اس کو یہاں شاھد اور مشہود کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ شاھد کے معنی ہیں گواہی دینے والا، اور مشہود وہ ہے جس کے اوپر گواہی دی جائے (گواہ و گواہی دادہ شدہ) اس کو دوسرے الفاظ میں داعی اور مدعو کہا جا سکتا ہے۔ شاھد سے مراد داعی ہے اور مشہود سے مراد مدعو۔

اللہ نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے یہ نظام قائم کیا ہے کہ اس نے ہر دور میں پیغمبر بھیجے۔ یہ پیغمبر خدا کے شاھد تھے۔ انھوں نے اپنے وقت کے انسانوں تک خدا کا دین پہنچایا اور اس کے لیے اپنی تمام طاقت صرف کر دی۔ ان کے مخاطبین کی حیثیت مشہود کی تھی یعنی وہ لوگ جن کے اوپر انھوں نے خدا کی گواہی کی تکمیل کی۔ قیامت کے دن یہ شاھد اور مشہود دونوں خدا کے یہاں جمع ہوں گے۔ خدا اپنے علم اور ریکارڈ کے ساتھ پیغمبروں کے

بیان کی بنیاد پر ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان فرق فرمائے گا اور ایک گروہ کے لیے رحمت کا اور دوسرے گروہ کے لیے عذاب کے فیصلہ کا اعلان کرے گا۔

آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد شاھد کی یہ حیثیت آپ کی امت کو حاصل ہو گئی جو لوگ قرآن کو خدا کی کتاب مانیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو اپنے لیے رہنما بنائیں ان کو اسی کے ساتھ شاھد کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے، اور ان کی ہم عصر قوموں کو مشہود کی۔ ان کی یہ لازمی ذمہ داری قرار پاتی ہے کہ وہ شاھد یا داعی کی حیثیت سے ہر زمانہ میں پیدا ہونے والے لوگوں کے درمیان خدا کے دین کا اعلان کریں، وہ ان کے سامنے خدا کے گواہ بن کر کھڑے ہوں۔ تاکہ جن کو ہدایت قبول کرنا ہے وہ ہدایت قبول کرلیں اور جو لوگ جان لینے کے باوجود خدا کے دین کا انکار کریں، ان کا مقدمہ جب آخرت کی عدالت میں قائم ہو تو وہ وہاں خدا کے گواہ کی حیثیت سے اپنا فریضہ انجام دے سکیں۔

اہل اسلام اور غیر اہل اسلام کے درمیان جو تعلق ہے وہ عام معنوں میں ایک قوم اور دوسری قوم کا نہیں ہے، بلکہ یہ داعی اور مدعو کا تعلق ہے۔ تعلق کی یہ نوعیت بے حد نازک ہے۔ داعی اور مدعو کے اس رشتہ کو اپنی اصل صورت میں برقرار رکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ انھیں دعوت دینا۔

ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان حریفانہ کش مکش جاری ہو جاتی ہے۔ مگر داعی اپنے مدعو کے ساتھ حریفانہ کش مکش کا تحمل نہیں کر سکتا۔ ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان مادی مفادات کا ٹکراؤ جاری رہتا ہے۔ مگر داعی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ اپنے مدعو گروہ سے مادی چیزوں کے لیے نزاع شروع کر دے۔ ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان اکثر یہ معرکہ جاری رہتا ہے کہ دونوں میں کون بڑا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے اوپر اپنے فخر کا اظہار کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

داعی اپنے مدعو کے ساتھ اصل دعوت کے سوا کسی بھی دوسری چیز کو نزاع کا عنوان بننے نہیں دیتا تاکہ دعوت کا عمل کسی رکاوٹ کے بغیر مسلسل جاری رہے۔

ناصح، امین

قرآن کی سورہ نمبر، میں بتایا گیا ہے کہ —— پیغمبر نے اپنی قوم کو دعوت دیتے ہوئے کہا کہ میں تم کو خدا کے پیغامات پہنچا رہا ہوں اور میں تمہارے لیے ناصح اور امین ہوں (وَاَنَا لَکُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ) الاعراف ۶۸

ناصح کا مطلب خیر خواہ ہے اور امین کا مطلب امانت دار۔ یہ داعی کا کلمہ ہے۔ داعی کی بیک وقت دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک خدا کی نسبت سے، اور دوسرے مخاطب کی نسبت سے۔ داعی اپنے مخاطب کی نسبت سے ان کا خیر خواہ ہوتا ہے اور اللہ کی نسبت سے اس کا امانت دار۔

خیر خواہی کا مطلب کیا ہے۔ سچی خیر خواہی یہ ہے کہ آدمی یک طرفہ طور پر دوسرے کا ہمدرد ہو، وہ دوسرے کو وہ چیز دینے کا حریص ہو جو اس کے نزدیک اس کی بھلائی کے لیے انتہائی طور پر ضروری ہے۔ جس کے بغیر اس کی زندگی کامیابی اور ترقی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتی۔

داعی اسی مفہوم میں اپنے مدعو کا سچا خیر خواہ ہوتا ہے۔ یہ خیر خواہی اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ مدعو کی روش سے بے پروا ہو کر یک طرفہ طور پر اس کی ہدایت کا حریص بنا رہے۔ چنانچہ داعی اپنی تنہائیوں میں مدعو کے لیے دعا کرتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ میں کون سا انداز اختیار کروں کہ میری بات مدعو کے لیے زیادہ سے زیادہ قابلِ فہم ہو جائے۔ اس معاملہ میں اس کا ہمدردی کا جذبہ اتنا بڑھا ہوا ہوتا ہے کہ وہ مدعو کی زیادتیوں کو نظر انداز کرتا رہتا ہے، وہ کڑوا بول بولے تب بھی داعی میٹھا بول بولتا ہے۔ وہ زیادتی کرتا ہے تب بھی داعی اس کو بھلا کر اس کی اصلاح کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ مدعو اگر اس کی غیرت پر حملہ کرے تب بھی وہ اس کو اپنے وقار کا سوال نہیں بناتا۔ داعی کے دل میں مدعو کی شفقت اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی حال میں اس سے جدا نہیں ہوتی۔

دعوت کا کام کوئی ایسی چیز نہیں جو لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ اعلان سے انجام پاتا ہو۔ یہ

زبانی اعلان کا معاملہ نہیں بلکہ دل سے خطاب کرنے کا معاملہ ہے۔ دعوت کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب کہ داعی کے سینہ میں اپنے مدعو کے لیے محبت وشفقت کے جذبات پیدا ہو جائیں۔ یہ جذبہ اتنا بڑھا ہوا ہو کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں۔ وہ بے تاب ہو کر خدا سے مدعو کی ہدایت کے لیے دعا کرنے لگے۔ باہر کی مجلسیں اگر اس کے دردمند کلام سے معمور ہوں تو اس کی تنہائیاں بے تابانہ دعاؤں سے۔

داعی کی شخصیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ امانت دار ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اپنے دین کو جس صورت میں بھیجا ہے اور جس طرح اسے بندوں تک پہنچانے کا حکم دیا ہے، ٹھیک اسی طرح اس کو خدا کے بندوں تک پہنچایا جائے، اس میں کسی بھی قسم کا کوئی فرق نہ کیا جائے۔

خدا نے اگر یہ کہا ہے کہ توحیدِ الٰہ کو دعوت کا مرکزی نقطہ بناؤ تو کسی اور چیز کو دعوت کا مرکزی نکتہ بنانے سے انتہائی حد تک پرہیز کیا جائے۔ خدا نے اگر کہا ہے کہ دعوت کو اساسی امور تک محدود رکھو تو اس کو تفصیلات کے دائرہ تک ہرگز نہ پھیلایا جائے۔ خدا نے اگر کہا ہے کہ فرد میں تغیر کو دعوت کا نشانہ بناؤ تو ہرگز ایسا طریقہ نہ اختیار کیا جائے کہ نظام میں تغیر اس کا نشانہ بن جائے۔ خدا نے اگر کہا ہے کہ دعوت میں سارا زور مسئلۂ آخرت پر دو تو مسائلِ دنیا کو اہمیت دینے والا انداز اختیار نہ کیا جائے۔ خدا نے اگر کہا ہے کہ دعوت کو اصلاحِ انسان پر مبنی قرار دو تو اصلاحِ سیاست کو دعوت کا عنوان نہ بنایا جائے۔ خدا نے اگر کہا ہے کہ دعوت کو اصولی بنیاد پر چلاؤ تو اُس کو اِس طرح نہ چلایا جائے کہ دعوت قومی مسائل کے حل کا عنوان بن جائے۔ خدا نے اگر کہا ہے کہ دعوت کے لیے خالص پُرامن جدوجہد کا انداز اختیار کیا جائے تو ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ دعوت مناظرہ اور متشددانہ ٹکراؤ کا انداز اختیار کر لے۔ خدا نے اگر یہ حکم دیا ہے کہ مدعو کی زیادتیوں پر صبر کرو تو ایسا نہ کیا جائے کہ دفاع کے نام پر مدعو کے خلاف لڑائی چھیڑ دی جائے۔

جس طرح دعوت فرض ہے اسی طرح یہ بھی فرض ہے کہ دعوت کے کام کو ٹھیک اسی طرح چلایا جائے جس طرح خدا نے اس کو چلانے کا حکم دیا ہے۔ اسی کا نام دعوتی امانت داری ہے۔

لوگوں کو باخبر کرنا

قرآن کی سورہ نمبر ۳ میں قدیم اہل کتاب کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ـــ اور جب اللہ نے اہلِ کتاب سے عہد لیا کہ تم خدا کی کتاب کو پوری طرح بیان کروگے لوگوں کے لیے۔ اور اس کو نہیں چھپاؤ گے۔ مگر انھوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا اور اس کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالا، کیسی بری چیز ہے جس کو وہ خرید رہے ہیں (آل عمران ۱۸۷)

جس قوم کو آسمانی ہدایت نامہ دیا جائے اس کو دینی اصطلاح میں حامل کتاب کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں یہود و نصاریٰ کو حاملِ کتاب ہونے کی حیثیت حاصل تھی پیغمبر آخر الزماںؐ کی بعثت کے بعد یہود و نصاریٰ کی یہ حیثیت ختم ہوگئی اور حاملِ کتاب ہونے کا مقام اب امت محمدیؐ کو حاصل ہوگیا۔

کسی گروہ کو جب خدا کی کتاب دی جاتی ہے تو یہ دینا کوئی سادہ واقعہ نہیں ہوتا۔ اس کے بعد اس قوم کی یہ لازمی ذمہ داری ہوجاتی ہے کہ وہ اس کتاب کے معاملہ میں دنیا کی بقیہ قوموں کے سامنے خدا کی نمائندگی کرے۔ وہ اس کو بے آمیز طور پر لوگوں کے سامنے پیش کرتی رہے۔ اسی بات کو حضرت مسیح نے اپنے خطبہ میں ان الفاظ میں کہا تھا :

"جو کچھ میں تم سے اندھیرے میں کہتا ہوں اجالے میں کہو اور جو کچھ تم کان میں سنتے ہو کوٹھوں پر اس کی منادی کرو" (متی ۱۰ : ۲۷)

خدا کو یہ مطلوب ہے کہ اس کا پیغام تمام انسانوں تک پہنچے۔ مگر خدا نے اس کی یہ صورت نہیں مقرر فرمائی کہ آسمان سے آواز آئے اور تمام لوگ اس کو براہِ راست سن لیں، یا کسی پہاڑ کی چوٹی پر تمام باتیں لکھی ہوئی ہوں، جس کو لوگ پڑھ کر جان لیں۔ اس کے بجائے خدا نے اس کا یہ نظام مقرر فرمایا ہے کہ ایک گروہ کو پیغمبر کے ذریعہ خدائی تعلیمات سے واقف کرایا جائے اور پھر یہ گروہ اس کو نسل در نسل ہر زمانہ کے لوگوں تک پہنچاتا رہے۔

پچھلے اہلِ کتاب اس ذمہ داری کو پورا نہ کرنے کے نتیجہ میں فضیلت سے محروم کردیے گئے۔ اسی طرح بعد کا گروہ اگر اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں ناکام رہے تو وہ بھی اسی طرح سنتِ الٰہی

کی زد میں آجائے گا جس طرح پہلا گروہ اس کی زد میں آیا۔

یہ تبیین یا ہر زمانہ کے لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچانا کوئی سادہ بات نہیں، یہ ایک عظیم قربانی کا معاملہ ہے۔ اس عمل پر خدا نے اس کے عاملین کے لیے جنت کی نعمتوں کا وعدہ کیا ہے، اس کی انجام دہی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اس کو انجام دینے والے اپنے آپ کو دنیا کے تقاضوں سے اوپر اٹھالیں۔

ہر زمانہ میں ایک طرف وہ انسانی نسل ہوتی ہے جو اپنی بے خبری کی بنا پر اس کی محتاج ہوتی ہے کہ اس کو مرنے سے پہلے یہ بتا دیا جائے کہ اس کے بارہ میں خدا کی مرضی کیا ہے، اور خدا کی عدالتی میزان میں پورا اترنے کے لیے اس کو کیا کیا کرنا ہے۔ دوسری طرف یہ واقعہ ہوتا ہے کہ طرح طرح کے مادی امکانات ظاہر ہو کر لوگوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ دنیوی ترقی اور کامیابی کے مختلف مواقع ان کو اپنی طرف بلاتے ہیں۔ ایسی حالت میں جو لوگ خدا کی کتاب کو پکڑیں اور اس کو خدا کے بندوں تک پہنچانے میں اپنی ساری طاقت صرف کر دیں انھوں نے گویا اپنا نام جنتی باشندوں کی فہرست میں لکھوالیا۔

خدا کی کتاب کا اعلان عام نہ کرنے کو قرآن میں کتمان قرار دیا گیا ہے۔ یعنی اس کو چھپانا۔ جو لوگ کتابِ خداوندی کے حامل ہوں مگر اس کی تعلیمات کو عام انسانوں تک نہ پہنچائیں وہ گویا کہ اس کو چھپا رہے ہیں۔ ایسے لوگ قرآن کی اس آیت کا مصداق ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ:
یعنی اس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اس گواہی کو چھپائے جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس آئی ہوئی ہے (البقرہ ۱۴۰)

کتابِ خداوندی کے حامل گروہ کے لیے کسی بھی عذر کی بنا پر کتاب کی تبیین کے کام کو روکنا جائز نہیں۔ اس معاملہ میں جو سبب بھی پیش کیا جائے وہ خدا کے نزدیک ناقابل قبول ہوگا کیونکہ مسئلہ عذر کا نہیں ہے بلکہ وہ سلسلۂ تبیین کے رک جانے کا مسئلہ ہے جو کسی بھی حال میں خدا کو منظور نہیں۔

اہل اسلام کی حیثیت خدا کے سفیر کی ہے۔ اگر وہ سفارت کی ذمہ داری انجام دیں تو ان کے لیے عظیم انعام ہوگا، اور وہ خدا کے خاص بندے قرار پائیں گے۔

اسلوبِ دعوت

قرآن کی سورہ نمبر ۱۶ میں ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے اچھے طریقے سے بحث کرو۔ بے شک تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ان کو بھی خوب جانتا ہے جو راہ پر چلنے والے ہیں۔ اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ کیا گیا ہے اور اور اگر تم صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے لیے بہت بہتر ہے۔ اور صبر کرو اور تمہارا صبر خدا ہی کی توفیق سے ہے۔ اور تم ان پر غم نہ کرو اور جو کچھ تدبیریں وہ کر رہے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہو۔ بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکی کرنے والے ہیں (النحل ۱۲۸ ـ ۱۲۵)

دعوت کا عمل ایک ایسا عمل ہے جو انتہائی سنجیدگی اور خیر خواہی کے جذبہ کے تحت ابھرتا ہے۔ خدا کے سامنے جواب دہی کا احساس آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ خدا کے بندوں کے سامنے داعی بن کر کھڑا ہو۔ وہ دوسروں کو اس لیے پکارتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے اگر میں نے ایسا نہ کیا تو میں قیامت کے دن پکڑا جاؤں گا۔ اس نفسیات کے قدرتی نتیجہ کے طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دعوتی عمل کا وہ انداز اختیار کر لیتا ہے جس کو حکمت، موعظت حسنہ اور جدال احسن کہا گیا ہے۔

حکمت سے مراد دلیل و برہان ہے۔ کوئی دعوتی عمل اس وقت حقیقی دعوتی عمل ہے جبکہ وہ ایسے دلائل کے ساتھ ہو جس میں مخاطب کے ذہن کی پوری رعایت شامل ہو۔ مخاطب کے نزدیک، کسی بات کے ثابت شدہ ہونے کی جو شرائط ہیں، ان شرائط کی تکمیل کے ساتھ جو کلام کیا جائے اسی کو یہاں حکمت کا کلام کہا گیا ہے۔ جس کلام میں مخاطب کی ذہنی و فکری رعایت شامل نہ ہو وہ غیر حکیمانہ کلام ہے اور ایسا کلام کسی کو داعی کا مرتبہ نہیں دیتا۔

موعظتِ حسنہ اس خصوصیت کا نام ہے جو دردمندی اور خیر خواہی کی نفسیات سے کسی کے کلام میں پیدا ہوتی ہے۔ جس داعی کا یہ حال ہو کہ خدا کی عظمت و جلال کے احساس

سے اس کی شخصیت کے اندر بھونچال آگیا ہو، جب وہ خدا کے بارہ میں بولے گا تو یقینی طور پر اس کے کلام میں عظمتِ خداوندی کی بجلیاں چمک اٹھیں گی۔ جو داعی جنت اور جہنم کو دیکھ کر، دوسروں کو اسے دکھانے کے لیے اٹھے، اس کے کلام میں یقینی طور پر جنت کی بہاریں اور جہنم کی ہولناکیاں گونجتی ہوئی نظر آئیں گی۔ ان چیزوں کی آمیزش داعی کے کلام کو ایسا بنا دے گی جو دلوں کو پگھلا دے اور آنکھوں کو اشکبار کر دے۔

دعوتی کلام کی ایجابی خصوصیات یہی دو ہیں ـــــ حکمت اور موعظتِ حسنہ۔ تاہم دنیا میں ہمیشہ کچھ ایسے لوگ موجود رہتے ہیں جو غیر ضروری بحثیں کرتے ہیں جن کا مقصد الجھانا ہوتا ہے نہ کہ سمجھنا سمجھانا۔ ایسے لوگوں کے بارہ میں داعی جو انداز اختیار کرتا ہے اسی کا نام "جدال بالتی ھی احسن" ہے۔ وہ ٹیڑھی بات کا جواب سیدھی بات سے دیتا ہے۔ وہ سخت الفاظ سن کر بھی اپنی زبان سے نرم الفاظ نکالتا ہے۔ وہ الزام تراشی کے مقابلہ میں استدلال اور تجزیہ کا انداز اختیار کرتا ہے۔ وہ اشتعال کے اسلوب کے جواب میں صبر کا اسلوب اختیار کرتا ہے۔

داعئ حق کی نظر سامنے کے انسان کی طرف نہیں ہوتی بلکہ اس خدا کی طرف ہوتی ہے جو سب کے اوپر ہے۔ اسی لیے وہ وہی بات کہتا ہے جو خدا کی میزان میں حقیقی بات ٹھہرے۔

داعی کا کردار ایسا ہونا چاہیے کہ اگر مخالفین کی طرف سے اسے کوئی ایسی تکلیف پہنچے جس کو وہ برداشت نہ کر سکے تو اس کو اتنا ہی کرنے کی اجازت ہے جتنا اس کے ساتھ کیا گیا ہے۔ تاہم یہ اجازت صرف انسان کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے بطور رعایت ہے۔ ورنہ داعی کا اصل کردار تو یہ ہونا چاہیے کہ وہ مدعو کی طرف سے پیش آنے والی ہر تکلیف پر صبر کرے۔ وہ مدعو سے حساب چکانے کے بجائے ایسے تمام معاملات کو خدا کے خانہ میں ڈال دے۔

داعی کو اصلاً جو ثبوت دینا ہے وہ یہ کہ وہ فی الواقع اللہ سے ڈرنے والا ہے۔ اس کے اندر وہ کردار پیدا ہو چکا ہے جو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ آدمی دنیا کے پردوں سے گزر کر خدا کو اس کی چھپی ہوئی عظمتوں کے ساتھ دیکھ لے۔ اگر داعی یہ ثبوت دے دے تو اس کے بعد بقیہ امور میں خدا اس کی طرف سے کافی ہو جاتا ہے۔

آدابِ دعوت

قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے — پس تم ان (مخالفین) سے اعراض کرو اور ان کو نصیحت کرو اور ان سے ایسی بات کہو جو ان کے دلوں میں اتر جائے (فاعرض عنهم وعظهم وقل لهم فی انفسهم قولاً بلیغاً النساء ۶۳)

"مخالفین سے اعراض کرو" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کو نظر انداز کرو۔ اس سے مراد مخالفین کی ذات سے اعراض کرنا نہیں، بلکہ ان کی مخالفت سے اعراض کرنا ہے، یعنی تم ان مخالفین کی ہدایت کے مستقل حریص بنے رہو۔ البتہ ان کی چھیڑی ہوئی غیر ضروری باتوں سے مکمل اعراض کرو تاکہ تمہارے اور ان کے درمیان بحث کا موضوع بدلنے نہ پائے۔ ان کی ضد اور بے جا اختلافات والی باتوں کو چھوڑتے ہوئے اپنی ساری کوشش اصل نکتۂ دعوت پر جمائے رکھو۔

یہ اعراض، دعوت جیسے تعمیری کام کے لیے انتہائی طور پر ضروری ہے۔ جب بھی کسی سماج میں دعوت الی اللہ کا کام کیا جائے گا تو کچھ لوگ اس کی مخالفت کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں گے۔ اب اگر داعی ان کی باتوں میں الجھ جائے تو دعوت کے بجائے مناظرہ اور تکرار شروع ہو جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دعوت کا مثبت مقصد حاصل نہ ہو سکے گا۔ اس لیے دعوت کی حکمت کا تقاضا ہے کہ مخالفین کی ذات کو کبھی نظر انداز نہ کیا جائے، البتہ یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ان کے مخالفانہ پروپیگنڈوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے دعوت کی اصل مہم جاری رکھی جائے۔ اعراض، قولِ بلیغ کی قیمت ہے۔ جو لوگ اعراض کی قیمت ادا نہ کریں وہ قولِ بلیغ کی زبان میں کلام بھی نہیں کر سکتے۔

"اور ان کو نصیحت کرو" یعنی ان کی مخالفتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی ناصحانہ مہم کو جاری رکھو۔ نصیحت وہ ہے جو دل سوزی اور خیر خواہی کے انداز میں ہو، جس کا مقصود اپنی برتری کو قائم کرنا اور فریق ثانی کو زک دینا نہ ہو، بلکہ اس کا تمام تر مقصود مخاطب کی خیر خواہی ہو، اس کا اسلوب سمجھانے کا اسلوب ہو نہ کہ مذمت کا اسلوب۔ غیر ناصحانہ انداز اگر انسان کے اندر چھپے ہوئے انا کے جذبہ کو جگاتا ہے تو ناصحانہ کلام کی تمام تر کوشش

یہ ہوتی ہے کہ انسان کے ضمیر کو جگائے، وہ اس کی فطرت کے تاروں کو متحرک کرے۔

"دل میں اترنے والی بات" کون سی ہوتی ہے، اور وہ بات کون سی ہوتی ہے جو لوگوں کے دلوں میں نہیں اترتی۔ دونوں کا فرق یہ ہے کہ جب کلام کرنے والا آدمی اس طرح کلام کرے کہ وہ ایک کی اَنا اور دوسرے کی اَنا کا ٹکراؤ بن جائے، تو ایسے حالات میں سننے والے کے اندر دفاعی جذبہ جاگ پڑتا ہے، وہ ایسی بات سے اپنے کو دور کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے، بجائے اس کے کہ وہ اس کو قبول کرلے۔ ایسے موقع پر کہنے والے کی بات کو مان لینا دوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو پسپا کرنے کے ہم معنی ہوتا ہے اور کوئی نہیں جو خود اپنے ارادہ سے اپنی پسپائی کو قبول کرلے۔

کلام کا دوسرا اسلوب وہ ہے جب کہ متکلم کی بات سننے والے کو خود اپنے فائدہ کی بات دکھائی دے۔ اس کے اندر اس کو اپنے مستقبل کی تعمیر نظر آتی ہو۔ ایسی بات، سننے والے کے سینہ میں کسی رکاوٹ کے بغیر اتر جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ اس کے دل کی گہرائیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ آدمی چاہنے لگتا ہے کہ فوراً اس کو لے لے، اس کی قبولیت میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہونے دے۔

حق کی دعوت انسان کی فطرت کو خطاب کرتی ہے۔ وہ ہر آدمی کے اپنے دل کی بات ہوتی ہے۔ اس لیے حق کی دعوت کو جب اس کے فطری اور بے آمیز انداز میں پیش کیا جائے تو سننے والا اس کو اجنبی محسوس نہیں کرتا، وہ اس کو خود اپنی فطرت کی بازگشت سمجھ کر قبول کرلیتا ہے۔

حق کی طرف بلانا گویا کہ انسان کو خود اس کی اپنی فطرت کی طرف بلانا ہے۔ ایسی حالت میں داعی کا اصل کام یہ ہے کہ وہ دعوتی پیغام کو اس کی بے آمیز حالت میں باقی رکھے۔ اور اسی کے ساتھ اس کا اسلوب بھی وہی رکھے جو فطرتِ انسانی کے مطابق ہو۔ داعی اگر ان باتوں کا پورا اہتمام کرے تو اس کی دعوت عملی طور پر ایسی ہو جائے گی جیسے کسی پیاسے کے سامنے پانی کا گلاس پیش کرنا۔

جب یہ نوبت آجائے تو مدعو داعی کی بات خود اپنی بات سمجھ کر قبول کرے گا۔

مخاطب کی زبان

قرآن کی سورہ نمبر ۱۴ میں بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب اس لیے اتاری گئی ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر اجالے کی طرف لایا جائے، اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ اور ہم نے جو پیغمبر بھی بھیجا اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ ان سے بیان کردے۔ پھر اللہ جس کو چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے (ابراہیم ۴)

حق کی دریافت سے پہلے آدمی اندھیرے میں رہتا ہے، حق کی دریافت کے بعد وہ اندھیرے سے نکل کر اجالے میں آجاتا ہے۔ یہ عظیم ذہنی سفر ہے۔ یہ تمام انقلابی واقعات سے زیادہ بڑا انقلابی واقعہ ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو گویا پیٹ سے پیدا ہونے والا انسان دوبارہ ایک نیا جنم لیتا ہے۔ ایک شخص جو پہلے عام انسانی سطح پر جی رہا تھا اب وہ اپنے جینے کے لیے ایک نئی اور بلند تر سطح حاصل کر لیتا ہے۔

ایسا انقلابی واقعہ کسی شخص کی زندگی میں آسانی کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ایک عظیم دعوتی مہم درکار ہے، ایک ایسی مہم جو ذہنی اندھیروں کو پھاڑنے والی ہو، جو انسان کو بے شعوری کی حالت سے نکال کر شعور کی حالت میں پہنچا دے۔

اس قسم کی دعوتی مہم کی کامیابی کے لیے جو چیزیں ضروری ہیں ان میں سے ایک اہم چیز یہ ہے کہ اس مہم کو اس زبان اور اس اسلوب میں جاری کیا جائے جو مخاطب کے لیے قابلِ فہم ہو۔ اور اسی کے ساتھ اس میں یہ تاثیر ہو کہ مخاطب اس کو اہم سمجھ کر اس کی طرف متوجہ ہو سکے۔

قرآن نہایت فصیح عربی زبان میں اتارا گیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جس زبان میں اپنے عرب معاصرین کو خطاب کرتے تھے وہ بھی ممتاز عربی اسلوب میں ہوتی تھی۔ یہی معاملہ ہر دور کے پیغمبروں کا رہا ہے۔ بعد کے زمانہ میں حاملین قرآن کو دنیا کی مختلف قوموں میں اس کی اشاعت کی جو ذمہ داری ادا کرنا ہے اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ یہ کام ہر قوم کے درمیان

اس زبان اور اس اسلوب میں ادا کیا جائے جو اس کے نزدیک اعلیٰ حیثیت رکھتی ہو۔

قرآنی اسلوب کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ سمجھنے کے لیے آسان ہے۔ قرآنی اسلوب میں اتنا زیادہ وضوح پایا جاتا ہے کہ کسی بھی شخص کے لیے اس کو سمجھنا مشکل نہیں ہوتا۔ یہی اسلوب ہر دور کے داعیانِ حق کو استعمال کرنا چاہیے۔ ان کو چاہیے کہ وہ خدا کے دین کی دعوت اور اس کے تقاضے کو ایسے انداز میں بیان کریں جو بالکل واضح ہو جس کو سمجھنے میں لوگوں کو کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

موجودہ زمانہ اس اعتبار سے ایک نیا زمانہ ہے جب کہ اسلوب کلام میں زبردست تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ مثلاً پہلے تمثیلی اسلوب کا عام رواج تھا۔ مگر اب غیر تمثیلی اسلوب پسند کیا جاتا ہے۔ پہلے زمانہ میں ادیبانہ اور شاعرانہ اسلوب پسند کیا جاتا تھا۔ مگر اب سائنٹفک اسلوب کو اہمیت دی جاتی ہے۔ پہلے زمانہ میں جذباتی اسلوب کی تعریف کی جاتی تھی مگر اب مبنی بر حقائق اسلوب کو موثر اسلوب سمجھا جاتا ہے، وغیرہ۔

اسی کے ساتھ استدلال کی زبان میں بھی غیر معمولی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ پہلے زمانہ میں قیاس یا مضمون بندی کو بھی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب ان چیزوں کو دلیل کا درجہ حاصل نہیں۔ اب تجزیاتی استدلال کو دلیل سمجھا جاتا ہے۔ نیز یہ کہ یہ بات پہلے سے زیادہ مانی جانے لگی ہے کہ دلیل کو مخاطب کے ذہنی مسلّمات پر مبنی ہونا چاہیے نہ یہ کہ اس کو خود اپنے مفروضات پر مبنی کرکے پیش کیا جائے۔

اس صورتِ حال نے اہل اسلام کی ذمہ داریوں میں ایک نئی ذمہ داری کا اضافہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ وہ عصری زبانوں کو پڑھیں، عصری اسلوب سے واقفیت حاصل کریں، عصری طرز استدلال کو بھر پور طور پر جانیں۔ یہ ابتداءً اپنے آپ کو تیار کرنے کا عمل ہے۔ جب موجودہ زمانہ کے داعی اپنے آپ کو اس طرح بخوبی طور پر تیار کرلیں، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوگا کہ وہ اپنی داعیانہ ذمہ داری کو پورا کریں اور آج کی قوموں کے سامنے حق کے سفیر بن سکیں۔ اس طرح کی تیاری کے بغیر اعلیٰ سطح پر دعوت کا کام انجام دینا ممکن نہیں۔

ضروری تیاری کے بغیر دعوتی عمل کبھی موثر نہیں ہو سکتا۔

نرم انداز

قرآن کی سورہ نمبر ۲۰ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ کو فرعون کی طرف اپنے پیغام کے ساتھ بھیجا تو ان سے فرمایا —— اور میں نے تم کو اپنے لیے منتخب کیا۔ جاؤ تم اور تمھارا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ۔ اور تم دونوں میری یاد میں سستی نہ کرنا۔ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ پس اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے (طٰہٰ ۴۴-۴۱)

داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ بہت زیادہ خدا کو یاد کرنے والا ہو، دعوتی عمل کے دوران خواہ اچھے حالات پیش آئیں یا برے حالات، ہر حال میں وہ خدا کو اس کی صفاتِ کمال کے ساتھ یاد کرتا رہے۔ یہ یاد داعی کے لیے اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ ہمیشہ اور ہر حال میں خدا کی مطلوب روش پر قائم رہے۔ وہ کسی بھی حال میں اپنے داعیانہ کردار کو نہ کھوئے۔

فرعون اپنے وقت کا ایک انتہائی سرکش انسان تھا۔ وہ ظلم و زیادتی میں آخری انتہا تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ کو اور ان کے بھائی ہارون کو فرعون کے پاس دعوتی مشن کے لیے بھیجا تو انھیں ہدایت کی کہ تم اس سے نرم انداز میں بولنا اور نرم اسلوب میں اس کے سامنے اپنی دعوت کو پیش کرنا۔

اس سے معلوم ہوا کہ داعی کا رویہ مدعو کے کردار سے متعین نہیں ہوتا۔ مدعو آزاد ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ لیکن داعی اس طرح آزاد نہیں، داعی کو خدا کے احکام کی پابندی میں چلنا ہے۔ داعی کو وہی روش اختیار کرنا ہے جو خدا کی پسند کے مطابق ہو، خواہ وہ روش اس کی اپنی پسند کے موافق ہو یا ناموافق۔

گویا داعی کے لیے دعوت میں نرم انداز اختیار کرنا بے حد ضروری ہے۔ فرعون جیسے سرکش انسان کے سامنے بھیجتے ہوئے یہ ہدایت کرنا ثابت کرتا ہے کہ دعوت کے لیے نرم اور حکیمانہ انداز مطلق طور پر مطلوب ہے۔ مدعو کی طرف سے کوئی بھی سختی یا سرکشی داعی کو یہ حق نہیں دیتی کہ وہ اپنی دعوت میں نرمی اور شفقت کا انداز کھو دے۔

"فرعون سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرے" کا جملہ حکمتِ دعوت کو بتاتا ہے۔ اس سے فطرت کا یہ قانون معلوم ہوتا ہے کہ سختی کو سختی کے ذریعہ کاٹا نہیں جاسکتا، سختی کے مسئلہ کو صرف نرمی کے ذریعہ حل کیا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ داعی کا رویہ مدعو کو دیکھ کر متعین نہیں ہوتا بلکہ خود اپنے ابدی اصولوں کے تحت متعین ہوتا ہے۔ داعی ایسا نہیں کرسکتا کہ مدعو کو سخت دیکھ کر خود بھی سخت ہو جائے۔ وہ ہر حال میں اپنے اس اصول پہ باقی رہتا ہے جو خدا نے اس کے لیے ابدی طور پر مقرر کر دیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدعو خواہ بظاہر سخت اور غیر اثر پذیر دکھائی دیتا ہو لیکن داعی اس وقت بھی اپنے اس یقین کو نہیں کھوتا کہ اس کی نرمی مدعو کی سختی پر غالب آجائے گی۔

نرمی میں یہ طاقت کیوں ہے۔ اس کا راز فطرت میں چھپا ہوا ہے۔ کوئی انسان جب بھی سخت دکھائی دیتا ہے تو یہ صرف اس کا اوپری رویہ ہوتا ہے۔ اس کی اندرونی فطرت میں پھر بھی یہ صلاحیت موجود رہتی ہے کہ کوئی حق بات اگر معقول انداز میں کہی جائے تو اس کی فطرت اس کو مجبور کرے گی کہ وہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرے۔

داعی کا نرم رویہ اس بات کا ضامن ہے کہ کبھی کوئی غیر متعلق چیز داعی اور مدعو کے درمیان رکاوٹ نہ بنے، کبھی بھی ایسا نہ ہو کہ کوئی چیز مدعو کے لیے غیرت کا سوال بن جائے اور وہ جاننے کے باوجود حق کو قبول نہ کرے۔

نرم انداز اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ داعی مدعو کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ بنالے۔ وہ ناخوش گواری کے معاملہ کو دوطرفہ بنانے کے بجائے اس کو یک طرفہ حیثیت دے دے۔ ناخوش گواری کے معاملہ کو اگر دوطرفہ بنیاد پر طے کرنے کی کوشش کی جائے تو فریق ثانی کبھی اس پر راضی نہیں ہوتا۔ لیکن اس کو یک طرفہ بناتے ہی اس کے حل کی راہیں نکل آتی ہیں، جو چیز بظاہر تلخی پیدا کرنے والی تھی، اچانک وہ اچھے تعلقات میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

داعی جب یک طرفہ طور پر نرم انداز اختیار کرے تو غیر ضروری الجھاؤ سے ہٹ کر ساری گفتگو صرف دعوت کے نکتہ پر مرتکز ہو جاتی ہے۔ داعی نرم انداز اختیار کر کے فریق ثانی سے یہ موقع چھین لیتا ہے کہ وہ غیر ضروری بحثیں پیدا کر کے داعی کو اپنے مقصد کی راہ سے ہٹا دے۔

صبر کی اہمیت

دعوتی عمل کے لیے صبر انتہائی طور پر ضروری ہے۔ جس طرح زمین کے بغیر درخت نہیں، اسی طرح صبر کے بغیر دعوت نہیں۔ دعوت کے پہلو سے، صبر کا مطلب یہ ہے کہ مدعو کی طرف سے پیش آنے والی زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کیا جائے۔ مدعو کے رویہ سے غیر متاثر رہ کر مثبت انداز میں دعوت کا کام جاری رکھا جائے۔

اِسی لیے قرآن میں صبر پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ایک جگہ داعیانِ حق کی زبان سے یہ جملہ نقل کیا گیا ہے کہ: وَلَنَصْبِرَنَّ عَلیٰ مَا آذَیْتُمُوْنَا وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُتَوَکِّلُوْنَ (ابراہیم ۱۲) یعنی "اور جو تکلیف تم ہمیں دو گے ہم اس پر صرف صبر کریں گے اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔" دوسری جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: فاصبر کما صبر أولوا العزم من الرسل ولا تستعجل لهم (الاحقاف ۳۵) یعنی "پس تم صبر کرو جس طرح ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا اور ان کے لیے جلدی نہ کرو۔"

دعوت کے کام میں صبر کی اہمیت اتنی زیادہ کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دعوت کا کام ہمیشہ ایسے لوگوں کے درمیان کیا جاتا ہے جو بگڑے ہوئے ہوں۔ جن میں اعتقادی اور اخلاقی خرابیاں پائی جاتی ہوں۔ مزید یہ کہ یہ انسان کی نفسیات ہے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے اس کو وہ صحیح سمجھ لیتا ہے۔ وہ اس کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کے خلاف بات میں اس کو اپنی ذات کی نفی دکھائی دیتی ہے۔ اس بنا پر جب بھی دعوت کا کام شروع کیا جائے تو مدعو کی طرف سے سخت قسم کا ردعمل پیش آتا ہے۔

ایسے حالات میں دعوت کے عمل کو کس طرح معتدل انداز میں جاری رکھا جائے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ داعی یک طرفہ طور پر صبر کرے وہ مدعو کی زیادتیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے دعوتی عمل کو جاری رکھے۔

معتدل فضا کی موجودگی دعوتی عمل کو موثر طور پہ جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ دعوت چوں کہ داعی کا درد ہوتا ہے نہ کہ مدعو کا درد، اس لیے یہ کام تنہا داعی کو کرنا ہے کہ

وہ مدعو کی اشتعال انگیز کارروائیوں کو صبر کے خانہ میں ڈال دے تاکہ دعوت کا عمل اپنی فطری رفتار سے جاری رہے۔

داعی کی صابرانہ روش سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ داعی اور اس کے مخاطب کے درمیان سنجیدہ انداز میں تبادلہ خیال جاری ہو۔ داعی کی کامیابی یہ ہے کہ اس کے اور مخاطب کے درمیان ساری گفتگو دلیل اور معقولیت کی زمین پر انجام پائے۔ وہ کسی بھی حال میں عزت و وقار کا سوال نہ بنے۔ بات جب بھی بگڑتی ہے دوطرفہ طور پر بگڑتی ہے۔ اگر معاملہ کا ایک فریق منفی ردعمل کا شکار نہ ہو تو بحث و گفتگو اپنے آپ ٹھنڈے اسلوب میں چلتی ہے، وہ بھٹک کر گرم اسلوب کی فضا میں نہیں پہنچتی۔

داعی کے یک طرفہ صبر کا دوسرا عظیم فائدہ یہ ہے کہ اس کی یہ روش مدعو کی فطرت کو جگانے میں کامیاب ہوتی ہے۔ ہر انسان پیدائشی طور پر حق کا پرستار ہے مگر مختلف حالات کے نتیجہ میں اس کی اس فطرت پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ داعی کا کام یہ ہے کہ وہ اس پردہ کو ہٹائے۔ وہ بالقوہ مومن کو بالفعل مومن میں تبدیل کر دے۔

صبر، نفسیاتی اعتبار سے مدعو کی ضرورت نہیں، وہ داعی کی ضرورت ہے۔ وہ مدعو کا مسئلہ نہیں، بلکہ وہ داعی کا مسئلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف داعی کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ یک طرفہ طور پر معتدل فضا کو باقی رکھنے کا اہتمام کرے۔ وہ یک طرفہ قربانی کے ذریعہ ان حالات کو برقرار رکھے جن میں یہ ممکن ہو کہ کہنے والا جو کچھ کہے، سننے والا اس کو کھلے ذہن کے ساتھ سنے اور کھلے دل کے ساتھ اس کو قبول کر سکے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو داعی کا صبر اس کے لیے دعوت کی راہ میں کامیابی کی کلید ہے۔ صبر اس کے لیے کوئی پسپائی کا فعل نہیں بلکہ وہ ایک حکیمانہ عمل ہے۔ وہ اپنے مقصد کو پانے کی ایک اچھی تدبیر ہے۔ صبر داعی کا پرامن ہتھیار ہے۔ اور بلاشبہ اس دنیا میں پُرامن ہتھیار سے زیادہ موثر اور کارگر کوئی دوسری چیز نہیں۔

دعوت کا عمل دو آدمیوں کے درمیان انجام پاتا ہے۔ ایک طرف داعی ہوتا ہے اور دوسری طرف مدعو۔ یہی چیز صبر کو دعوت کا لازمی جزء بنا دیتی ہے۔

تالیفِ قلب

قرآن کی سورہ نمبر ۹ میں صدقات (زکوٰۃ) کی مدوں کو بتایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رقم شریعت میں آٹھ قسم کے لوگوں کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جس کی تالیفِ قلب مقصود ہو (المؤلّفۃِ قلوبُھم) التوبہ ۶۰

المؤلفۃ قلوبھم سے مراد، فقہاء کے مطابق، وہ لوگ ہیں جن کو اسلام کی طرف راغب کرنا مقصود ہو۔ یا جو اسلام میں کمزور ہوں۔ یہ صرف ایک مالی مدد کا معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک اہم دینی حکمت ہے جو دعوتی مہم کی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔ اس کو دوسرے الفاظ میں مدعو کی رعایت کہا جا سکتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری دعوتی مہم کے درمیان اس اصول کا شدت کے ساتھ اہتمام فرمایا۔ آپ نے ہر موقع پر مدعو کے ساتھ رعایت کا معاملہ کیا۔ مدعو قوم کے کسی فرد نے اگر مدینہ کی مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا تو آپ نے اس پر نہ غصہ کیا اور نہ ملامت۔ اس کے پیچھے وہی حکمت تھی جس کو شریعت میں تالیفِ قلب کہا گیا ہے۔

اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تک گئے کہ جب آپ نے مکہ سے مدینہ کے لیے ہجرت فرمائی تو وہاں تقریباً ڈیڑھ سال تک یہود کے قبلہ (بیت المقدس) کو اپنا قبلہ بنا لیا۔ یہ اس لیے تھا تاکہ یہود کو متوحش کیے بغیر ان کے درمیان دعوتِ توحید کی مہم جاری کی جا سکے۔ اہلِ اسلام اور یہود کے درمیان قربت کی وہ فضا قائم ہو جس میں دعوت کا عمل آسانی کے ساتھ انجام پا سکے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ آئے تو آپ نے قبلۂ نماز کے لیے قدس کا انتخاب فرمایا، یہود کے ایمان کی طمع میں اور ان کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے لیے (فاختار القدس طمعاً فی ایمان الیہود واستمالتھم) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۱/۱۵۰

فریقِ ثانی کی رعایت ہر مشن کا ایک ضروری حصہ ہے۔ صاحبِ مشن ہمیشہ فریقِ ثانی کے جذبات کی رعایت کرتا ہے تاکہ اس کو اپنے پیغام کی طرف مائل کر سکے۔ دعوت الی اللہ بلاشبہ سب سے بڑا مشن ہے۔ اس لیے اس مشن میں مدعو کی رعایت کی بے حد اہمیت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مدعو کی رعایت کیے بغیر دعوتی مشن کو کامیابی کے ساتھ جاری نہیں رکھا جاسکتا۔

داعی اپنی ذات کے بارہ میں سخت ہوتا ہے لیکن مدعو کے بارہ میں وہ ہمیشہ نرمی کو پسند کرتا ہے۔ اپنی ذات کے معاملہ میں وہ انتہائی حد تک بااصول ہوتا ہے۔ مگر جب مدعو کا معاملہ ہو تو وہ عملی (پریکٹیکل) بن جاتا ہے۔ وہ اپنے لیے کبھی رعایت کا طالب نہیں ہوتا۔ مگر مدعو کے معاملہ میں وہ ہمیشہ رعایت کا انداز اختیار کرتا ہے۔

داعی کے اندر اپنے مدعو کے لیے تالیف یا رعایت کا جذبہ کیوں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ داعی اپنے مدعو کی ہدایت کا حریص ہوتا ہے۔ داعی کو یقین ہوتا ہے کہ مدعو کی اصل فطرت بھی وہی ہے جو خود اس کی ہے۔ وہ بھی اسی طرح حق کو قبول کر سکتا ہے جس طرح خود اس نے قبول کیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں داعی اپنے مدعو کے حق میں آخری حد تک پُرامید بن جاتا ہے۔ چونکہ مدعو کے بارہ میں اس کی امید کبھی ختم نہیں ہوتی اس لیے مدعو کے حق میں اس کا مراعاتی برتاؤ بھی کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ کسی حال میں اس کو گوارا نہیں کرتا کہ کوئی مسئلہ غیر ضروری طور پر اٹھ کر اس معتدل فضا کو برہم کر دے جو دعوت کو موثر طور پر جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ تالیفِ قلب کا عمل کبھی مادی تعاون کے ذریعہ ہوتا ہے اور کبھی میٹھے بول کے ذریعہ۔

تالیف قلب اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ غیر اساسی امور میں مدعو کی پسند کو اپنی پسند بنا لیا جائے۔ تاکہ داعی اور مدعو کے درمیان اُنس اور قربت ہو اور مدعو کے ذہن میں دعوت کی اہمیت کو اتارنا آسان ہو جائے۔ کیونکہ آدمی کو جب تک انس اور قربت نہ ہو وہ کسی کی بات کو سنجیدگی کے ساتھ سننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔

خدا کے دین کا داعی بننا اپنے آپ کو بہت بڑی قربانی کے لیے پیش کرنا ہے۔ اس قربانی کا مشکل ترین پہلو یہی تالیفِ قلب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک گروہ جو ہدایت سے دور ہو، جو ظلم اور سرکشی کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہو، جس کا پورا کلچر دوسرے نہج پر بنا ہو، ایسے گروہ کے ساتھ نرمی اور رعایت کا انداز اختیار کرنا صبر کی قربانی چاہتا ہے۔ صبر کی یہ قربانی دعوت کی راہ میں لازمی طور پر ضروری ہے اس کے بغیر داعی کا دعوتی منصوبہ کبھی کامیابی کے ساتھ پورا نہیں کیا جاسکتا۔

توکل علی اللہ

قرآن کی سورہ نمبر ۳۳ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے دعوت کے احکام و آداب بتائے گئے ہیں۔ یہ احکام و آداب جتنا پیغمبر سے متعلق ہیں اتنا ہی آپ کی امت کے ان لوگوں سے بھی متعلق ہیں جو آپ کے بعد آپ کی نیابت میں دعوتِ عام کا کام کریں۔ وہ آیت یہ ہے۔

یاایّھا النّبیّ اِنّا ارسلنٰکَ شاھِدًا ومُبشّراً ونذیراً وداعیاً اِلی اللّٰہ باذنِہٖ وسِراجاً مُّنیراًو بَشّرِ اَلمُؤمنِینَ بِاَنّ لَھُم مِنَ اللّٰہ فَضلاً کبِیراً وَلاتُطِعِ اَلکافِرِینَ والمُنافِقِینَ وَدَعْ اذاھُم وتوَکّل علَے اللّٰہِ وکفٰی بِاللّٰہِ وَکیلاً۔

اے نبی ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اور اللہ کی طرف اس کے اذن سے، دعوت دینے والا اور ایک روشن چراغ، اور مومنوں کو بشارت دے دو کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بہت بڑا فضل ہے۔ اور تم منکروں اور منافقوں کی بات نہ مانو۔ اور ان کے ستانے کو نظر انداز کرو۔ اور اللہ پر بھروسہ رکھو، اور اللہ بھروسہ کے لیے کافی ہے۔

شاھد، مبشر، نذیر، داعی یہ سب ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔ پیغمبر کا مشن یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو زندگی کی حقیقت سے آگاہ کرے۔ وہ لوگوں کو جنت اور جہنم کی خبر دے۔ یہ ایک دعوتی عمل ہے اور اسی دعوتی عمل کی بنیاد پر پیغمبر آخرت میں ان لوگوں کے بارہ میں گواہی دے گا جس پر اس نے امر حق پہنچایا۔ اور پھر کسی نے مانا اور کسی نے نہیں مانا۔

پیغمبر کا جو مشن ہے وہی امتِ مسلمہ کا مشن بھی ہے۔ اس راہ میں لوگوں کی طرف سے اذیتیں پیش آتی ہیں کوئی ساتھ نہیں دیتا اور کوئی وقتی طور پر ساتھ دیتا ہے۔ اور پھر جھوٹے الفاظ بول کر الگ ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں خدا پر بھروسہ ہی وہ چیز ہے جو

پیغمبر (یا اس کی پیروی کرنے والے داعی) کو دعوتی عمل پر ثابت قدم رکھ سکتا ہے۔ لوگوں کی طرف سے جو کچھ پیش آئے اس پر صبر کرنا اور اس کو نظر انداز کرنا۔ اور ہر حال میں خدا پر اپنی نظر جمائے رکھنا یہی اسلامی دعوت کا کام کرنے کے لیے اصل سرمایہ ہے۔

"اور تم ان کے ستانے کو نظر انداز کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو" —— اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ دعوتی عمل کے بعد مدعو کی طرف سے جو زیادتیاں کی جائیں ان کو نظر انداز کرو۔ مدعو اگر تمہاری دعوت کو سن کر سخت ردعمل کا اظہار کرتا ہے تو اس سے اعراض کرتے ہوئے اپنی دعوتی مہم کو جاری رکھو۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں ہمیشہ ایک گروہ کی طرف سے دوسرے گروہ کو شکایتیں ہوتی ہیں۔ یہاں ہمیشہ ایک گروہ اس احساس سے دوچار رہتا ہے کہ دوسرے گروہ نے اس کے ساتھ حق تلفی اور بے انصافی کا معاملہ کیا ہے۔ اس لیے اس کو لڑکر اپنا حق وصول کرنا چاہیے مگر داعی کو اس کی اجازت نہیں۔

داعی کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس قسم کے احساسات سے اوپر اٹھائے، وہ اپنا حق وصول کرنے کے بجائے دوسروں کا حق انھیں پہنچانے کے لیے فکرمند ہو وہ اپنے دنیوی نقصان کو بھلائے، اور دوسروں کو اس عظیم تر نقصان سے بچانے کے لیے سرگرم ہو جو آخرت میں ان کے ساتھ پیش آنے والا ہے۔

یہ داعی کی طرف سے بلاشبہ ایک قربانی کا معاملہ ہے۔ مگر اللہ کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ وہ داعی کے اس نقصان کی تلافی فرمائے گا۔ دنیوی مسائل میں وہ داعی کے لیے اس کا بدل بن جائے گا۔

دعوت کا عمل دینے کا عمل ہے، وہ لینے کا عمل نہیں۔ اس کا تقاضا ہے کہ داعی اپنے فریضہ کی ادائیگی میں صرف اپنی ذمہ داریوں کو یاد رکھے، وہ مدعو کے طرز عمل سے بے پرواہ ہو کر اس کو حق کا پیغام پہنچاتا رہے۔ داعی کا ذہن یہ ہونا چاہیے کہ مجھے انسانوں کو دینا ہے اور اس کی قیمت کے لیے مجھے صرف خدا سے امید رکھنا ہے۔ یہی جذبہ اس بات کا ضامن ہے کہ دعوت کا عمل اپنی صحیح صورت میں جاری رہے۔ اللہ پر اعتماد ہی داعی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

مچھلی کے پیٹ میں

خدا کے پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر حضرت یونس علیہ السلام تھے۔ وہ عراق (نینوی) کے لوگوں کی طرف بھیجے گئے۔ ان کا قصہ قرآن میں اس طرح آیا ہے ——— اور بیشک یونس بھی رسولوں میں سے تھا۔ جب کہ وہ بھاگ کر بھری ہوئی کشتی پر پہنچا۔ پھر قرعہ ڈالا تو وہی خطاوار نکلا۔ پھر اس کو مچھلی نے نگل لیا۔ اور وہ اپنے کو ملامت کر رہا تھا۔ پس اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا تو لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن تک اس کے پیٹ ہی میں رہتا۔ پھر ہم نے اس کو ایک میدان میں ڈال دیا اور وہ نڈھال تھا۔ اور ہم نے اس پر ایک بیل دار درخت اگا دیا۔ اور ہم نے اس کو ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی طرف بھیجا۔ پھر وہ لوگ ایمان لائے تو ہم نے ان کو فائدہ اٹھانے دیا ایک مدت تک (الصافات ۱۴۸-۱۳۹)

حضرت یونس علیہ السلام خدا کے پیغمبر ہونے کے باوجود کیوں مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے۔ اس کا سبب ان کی ایک اجتہادی خطا تھی۔ انھوں نے اپنی مدعو قوم کے درمیان دعوتِ توحید کا کام کیا۔ ایک عرصہ تک انھیں دعوت پہنچانے کے باوجود ان کی قوم ایمان نہ لائی۔ پیغمبر کے لیے اللہ کی یہ سنت ہے کہ پیغمبر جب اپنی قوم پر آخری معنوں میں اتمام حجت کر دے تو اس کے بعد خدا کے حکم کے تحت وہ مدعو قوم کو چھوڑ دیتا ہے۔ تاکہ خدا اس قوم کے اوپر سزا کا نفاد کر سکے۔ حضرت یونس نے ایک عرصہ کے بعد بطور خود یہ سمجھا کہ وہ دعوت کا کام ضروری حد تک کر چکے ہیں، اور اب انھیں وہاں سے چلا جانا چاہیے، چنانچہ وہ اپنی قوم کو چھوڑ کر باہر چلے گئے۔

مگر یہ حضرت یونس کا ایک اجتہادی فعل تھا۔ ان کا اندازہ درست نہ تھا۔ ان کی دعوتی مہم ابھی اتمام حجت کے مرحلہ تک نہیں پہنچی تھی کہ انھوں نے قبل از وقت اپنی قوم کو چھوڑ دیا۔

حضرت یونس علیہ السلام کا یہ واقعہ قرآن میں اس لیے بیان کیا گیا ہے تاکہ لوگ جانیں کہ دعوت کے معاملہ میں کوتاہی کا انجام داعی کے حق میں کیا ہوتا ہے۔ ایسے ہر واقعہ کے بعد داعی خدا کی گرفت میں آجاتا ہے۔ حتی کہ اگر اس نے اس معاملہ میں اجتہادی خطا کی بنا پر صرف اتنا کیا ہے کہ دعوت کے عمل کو قبل از وقت چھوڑ دیا تب بھی اس معاملہ میں وہ خدا کی پکڑ سے بچنے والا نہیں۔

اس واقعہ سے مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ داعی یا کوئی داعی گروہ اگر اس کوتاہی کی زد میں آجائے تو اس کی نجات کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ اپنی غلطی کا کھلا اعتراف کرے اور دوبارہ مدعو قوم کی طرف واپس جائے اور اس دعوتی کام کو تمام ضروری تقاضوں کے ساتھ انجام دے جس کو اس نے اس سے پہلے چھوڑ دیا تھا۔

اس واقعہ میں "مچھلی کا پیٹ" ایک علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب بھی کوئی داعی یا کوئی داعی گروہ دعوتی کوتاہی کرے تو کوئی سمندری مچھلی آئے گی اور اس کو نگل لے گی۔ اس کے بجائے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا داعی یا ایسا داعی گروہ خدا کی پکڑ میں آجائے گا۔ وہ ایسے مسائل میں گھر جائے گا جس سے نکلنا اس کے لیے ممکن نہ ہوگا۔

اس اعتبار سے اہل اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو خدا کے عذاب سے بچانے کی کوشش کریں۔ اگر وہ دوسروں کے لیے ایسا نہیں کریں گے تو مذکورہ سنت الٰہی کے مطابق وہ خود خدا کی زد میں آجائیں گے اور پھر کوئی نہیں ہوگا جو ان کو خدا کی پکڑ سے بچا سکے۔

دنیا میں ایسے لوگوں کی پکڑ مختلف انداز سے ہوتی ہے۔ ان پر معاشی بدحالی طاری کر دی جائے، ان کے اوپر ان کے دشمن مسلط ہو جائیں، وہ باہمی نزاعات کا شکار ہو جائیں، وہ دوسری قوموں کے استحصال کا میدان بن جائیں، ان کی کوئی چیز ان کے کام نہ آئے، حتیٰ کہ دولت اور اقتدار بھی، ان کی کوششیں حبطِ اعمال کا شکار ہو کر رہ جائیں، وہ کوشش کریں مگر ان کی کوشش بے نتیجہ ہو، وہ قربانیاں دیں مگر ان کی قربانیاں صرف یک طرفہ تباہی کے ہم معنی ہوں، وہ دنیا کی قوموں کے درمیان ایک بے وزن گروہ بن کر رہ جائیں۔

دعوتی کوتاہی خواہ قصداً ہو یا وہ اجتہادی خطا کے طور پر پیش آئے، ہر حال میں وہ قابلِ مواخذہ ہے۔ حتیٰ کہ دوسرے پہلو سے ان کے صالح اعمال بھی انھیں اس معاملہ میں خدا کی پکڑ سے نہیں بچا سکتے۔

دعوت، اصلاح

قرآن کی اصطلاح میں دعوت اور اصلاح دو الگ الگ کاموں کے عنوان ہیں۔ دعوت سے مراد غیر مسلموں کو دین الٰہی کا مخاطب بنانا ہے (الشوریٰ ۱۵) اور اصلاح سے مراد وہ عمل ہے جو اہل اسلام کی داخلی درستگی کے لیے کیا جائے (الحجرات ۹) مجازی طور پر کبھی ایک لفظ کا اطلاق دوسرے عمل کے لیے کیا جاسکتا ہے۔ تاہم یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف عمل ہیں اور دونوں کے تقاضے ایک دوسرے سے جدا ہیں۔

دعوت یا دعوت الی اللہ سے مراد یہ ہے کہ غیر مسلموں میں خدا کے دین کا پیغام پہنچایا جائے۔ یہ عمل ایک خالص اصولی عمل ہے اس کا تعلق نہ اہل اسلام کے قومی معاملہ سے ہے اور نہ کسی دنیوی یا مادی معاملہ سے۔ داعی کے لیے لازم ہے کہ وہ دعوت کے کام میں ہرگز کسی دوسرے تقاضے کو شریک نہ کرے ورنہ وہ دعوتی عمل کے بجائے قومی عمل بن جائے گا اور دعوتی اعتبار سے اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

دعوت کا نشانہ بے خبروں کی بے خبری کو توڑنا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو خدا کے تخلیقی منصوبہ سے آگاہ کیا جائے۔ ان کو بتایا جائے کہ ان کا خالق کون ہے اور دنیا میں وہ انھیں کس روش کے ساتھ دیکھنا چاہتا ہے اور یہ کہ موت کے بعد ان سے ان کی دنیوی زندگی کا حساب لیا جائے گا اور اس کے بعد خدا کی عدالت میں ان کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا۔

یہ پورا معاملہ ایک خالص اصولی معاملہ ہے اور اصولی بنیاد ہی پر اس کو جاری کرنا ہے، کسی بھی عذر کی بنا پر کسی غیر دعوتی تقاضے کو اس عمل میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے تقاضے، اگر وہ ضروری ہوں تو ان کو ان کی نوعیت کے اعتبار سے، دوسرے ناموں کے ساتھ انجام دیا جاسکتا ہے۔ لیکن دعوت کے عنوان کے تحت کسی غیر دعوتی تقاضے کو شامل کرنا ایک جرم کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے ہر حال میں پرہیز کرنا چاہیے۔

دعوت کے عمل کا تعلق عام انسانوں سے ہے نہ کہ کسی خاص فرقہ یا گروہ سے، اس

لیے اس کام کو وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو اپنے سینہ میں انسانیتِ عامہ کے لیے محبت کا جذبہ رکھتے ہوں جو وسیع تر انسانیت کی بھلائی کے لیے تڑپنے والے ہوں۔

اصلاح سے مراد مسلمانوں کے باہمی معاملات کی درستگی ہے۔ یہ درستگی فکری اعتبار سے بھی ہو سکتی ہے اور عملی اعتبار سے بھی۔ وقت کے معاشرہ کو دیکھ کر یہ طے کیا جائے گا کہ وہ شرعی اعتبار سے کس حال میں ہے اور اسے کس قسم کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

ایک کام یہ ہے کہ ہر نسل میں اہلِ اسلام کے درمیان ایمانی بیداری کو تازہ کیا جاتا رہے۔ لوگوں کے تقلیدی ایمان کو شعوری ایمان بنایا جائے، لوگوں کے اندر عبادات کی روح پیدا کی جائے، یہ کوشش کی جائے کہ لوگ اسلامی کردار کے مطابق دنیا میں زندگی گزاریں،، اسی طرح نزاعی معاملات میں صلح کرانا، لوگوں کے اندر اتحاد کی فضا پیدا کرنا، یہ کوشش کرنا کہ لوگ مادہ پرستی میں غرق نہ ہوں بلکہ آخرت پسندانہ زندگی گزاریں۔ یہ سارے کام اصلاح کے زمرہ میں شامل ہیں۔

اسی طرح اہلِ اسلام کے تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی مسائل میں انھیں رہنمائی دینا، ان مقاصد کے لیے ادارے قائم کرنا، یہ سب بھی اصلاح کے کام میں شامل ہیں۔ اسی طرح اہل اسلام کے سیاسی اور دفاعی مسائل ہیں۔ ان مسائل میں بھی اگر خالص شرعی اصول کے مطابق ضروری کوشش کی جائے تو ان کا شمار بھی اصلاح کے کام میں ہوگا۔ تاہم اس قسم کا کوئی کام اسی وقت تک اسلامی اعتبار سے اصلاح کا کام کہا جائے گا جب کہ وہ مکمل طور پر شرعی حدود میں انجام دیا جائے۔ قومی طرز کے ہنگامے، یا دنیوی قسم کی سیاست، یا دفاع کے نام پر قیادتی لڑائیاں، یہ اصلاح کے کاموں میں شامل نہیں سمجھے جائیں گے۔

یہ دوسرا کام اصلاحی اعتبار سے کم اہم نہیں ہے۔ اسی کو قرآن و حدیث میں نہی عن المنکر کہا گیا ہے۔ نہی عن المنکر کا کام اگر صحیح طور پر زندہ ہو تو وہ اہل اسلام کے لیے اس بات کی ضمانت بن جائے گا کہ وہ صراطِ مستقیم پر قائم رہیں اور اس سے کبھی منحرف نہ ہونے پائیں۔

دعوت بھی ضروری ہے اور اصلاح بھی ضروری۔ مگر دونوں کاموں کی نوعیت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

عمل شرط نہیں

قرآن کی سورہ البقرہ (آیت ۴۴) کی تشریح کے تحت مفسر ابن کثیر نے لکھا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرنے والے کے لیے بجائے خود یہ ضروری ہے کہ وہ دوسروں کو جس بات کی تلقین کر رہا ہے وہ خود بھی اس پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔ مگر یہ عمل خود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شرط نہیں۔ اس معاملہ میں صحیح قول یہ ہے کہ عالم معروف کا حکم دے گا خواہ وہ اسے خود نہ کرتا ہو، اور وہ لوگوں کو منکر سے روکے گا خواہ وہ خود اس کا مرتکب ہو، سعید بن جبیر نے کہا کہ اگر ایسا ہو کہ آدمی صرف اس وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرے جب کہ وہ ہر نقص سے پاک ہو جائے، تو کبھی کوئی شخص نہ لوگوں سے معروف کے لیے کہتا اور نہ منکر سے روکتا، مالک نے کہا کہ سعید بن جبیر نے درست کہا۔ ہم میں سے کون ہے جس میں کوئی کمی نہ ہو:

والصحیح ان العالم یامر بالمعروف وان لم یفعلہ وینھی عن المنکر وان ارتکبہ، قال مالک عن ربیعۃ سمعت سعید بن جبیر یقول لو کان المرء لا یامر بالمعروف ولا ینھی عن المنکر حتی لا یکون فیہ شئ ما امر احد بمعروف ولا نھی عن منکر۔ قال مالک وصدق من ذا الذی لیس فیہ شئ" (تفسیر ابن کثیر ۱/۸۵)

سورہ بقرہ کی مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے القرطبی نے بھی ٹھیک یہی بات لکھی ہے۔ اور بتایا ہے کہ اس معاملہ میں علماء کا زیادہ صحیح اور معتبر قول یہ ہے کہ تبلیغ و نصیحت کا کام ہر حال میں ضروری ہے۔ اس کے لیے یہ شرط نہیں کہ پہلے عامل بن جاؤ اور اس کے بعد تبلیغ کرو (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۱/۳۶۷)

دعوت و تبلیغ کے لیے اگر یہ شرط لگائی جائے کہ پہلے ساری دنیا کے مسلمانوں کی اصلاح کر لو اور اس کے بعد غیر مسلموں میں اسلام کا پیغام پہنچاؤ تو یہ شرط غیر شرعی بھی ہوگی اور نامعقول بھی۔ قرآن و حدیث میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اسلام کو ماننے والے پہلے اپنی مکمل اصلاح کر لیں اس کے بعد وہ غیر مسلموں کی اصلاح کے لیے اٹھیں۔ قرآن و حدیث اس

قسم کی شرط سے مکمل طور پر خالی ہیں۔

شریعت میں برعکس طور پر یہ تعلیم ہے کہ تمہارے پاس دین کا ادھورا علم ہو تب بھی تم اس کو پہنچانے سے دریغ نہ کرو۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : بلّغوا عنّی ولو آیۃً (فتح الباری ۵۰۲/۶) یعنی میری طرف سے پہنچاؤ چاہے ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صحابہ کا معاملہ یہی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدتِ نبوت میں نصف سے زیادہ عرصہ تک یہ حال تھا کہ نماز باجماعت اور ماہِ رمضان کے روزے کا حکم نہیں آیا تھا۔ اور اسی طرح دوسرے بہت سے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ گویا صحابہ کے پاس دورِ نبوت کی بیشتر مدت تک نہ مکمل قرآن تھا اور نہ مکمل شریعت۔ اس کے باوجود تمام صحابہ دین کے مبلغ بنے ہوئے تھے۔ اگر اجتماعی سطح پر دین کی مکمل پیروی تبلیغ کے لیے شرط ہو تو صحابہ اس کارِ تبلیغ کے اہل ہی نہ تھے۔ کیوں کہ ان کے پاس نہ مکمل دین تھا اور نہ انھوں نے اس کو نافذ کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دین کی مکمل پیروی کا مسئلہ ایک الگ مسئلہ ہے اور دعوت و تبلیغ کا مسئلہ ایک الگ مسئلہ۔ دونوں کے احکام ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور اسی طرح دونوں کی فرضیت بھی ایک دوسرے سے مختلف۔

جہاں تک ذاتی عمل کا سوال ہے اس کو دعوت کی شرط قرار دینا بداہتہً غلط ہے۔ اس لیے کہ کوئی بھی شخص بشری کوتاہیوں سے خالی نہیں ہو سکتا۔ حتی کہ بالفرض اگر کوئی ہر قسم کے نقائص سے پاک ہو تب بھی اس کا احساسِ عبدیت اس میں مانع ہوتا ہے کہ وہ اپنے کو کامل معنوں میں باعمل سمجھنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ ستر بار استغفار فرماتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر عمل کو تبلیغ کے لیے شرط کا درجہ دے دیا جائے تو کبھی کوئی شخص دعوت کا کام نہیں کرے گا۔ کیوں کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص اپنے آپ کو پورے معنوں میں باعمل سمجھنے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ دعوت کا کام مسئولیت اور ذمہ داری کے احساس کے تحت کیا جاتا ہے نہ کہ اس احساس کے تحت کہ اب میں پوری طرح باعمل بن چکا ہوں۔ اور اب مجھے دوسروں کے درمیان دعوت و تبلیغ کے لیے اٹھنا چاہیے۔

انسانیت کو بچانا

ایک اندھا آدمی اگر کنویں کی طرف بڑھ رہا ہو اور یہ اندیشہ ہو کہ اگر وہ اسی طرح چلتا رہا تو چند لمحوں میں وہ کنویں کے اندر گر جائے گا۔ تو ایسی حالت میں فقہ کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ دیکھنے والے کو چاہیے کہ وہ دوڑ کر اسے کنویں میں گرنے سے بچائے۔ اس وقت اگر وہ اپنا راستہ طے کر رہا ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنا راستہ چھوڑ دے۔ اگر وہ کھانا کھا رہا ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ کھانا چھوڑ کر اس کی طرف دوڑے۔ اگر وہ نماز پڑھ رہا ہو تو ضروری ہے کہ وہ نیت توڑ کر وہاں پہنچے اور اس کو بچائے۔ یہ بھی مسئلہ ہے کہ ایسے موقع پر اس کو صرف البئر البئر (کنواں، کنواں) کہنا چاہیے۔ اس کو کوئی تمہیدی جملہ بولنا نہیں چاہیے تاکہ بلا تاخیر اندھے کو متنبہ کیا جا سکے۔

شریعت کا یہ مسئلہ اس وقت ہے جب کہ کسی ایک شخص کے لیے دنیا کے کسی کنویں میں گرنے کا اندیشہ ہو۔ اب اگر پوری انسانیت اپنی بے خبری کی بنا پر آخرت کے شدید تر کنویں میں گرنے جا رہی ہو، ایسی حالت میں کیا یہ اسلام کے نزدیک کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔ وہ ہے اور یقیناً ہے اور وہ یہی ہے کہ کسی بھی چیز کو عذر بنائے بغیر انسانی قافلوں کی طرف دوڑا جائے۔ ان کو آنے والے عظیم خطرہ سے باخبر کیا جائے۔ قبل اس کے کہ وہ اس میں گر کر ہلاک ہو چکے ہوں۔

یہی وہ ذمہ داری ہے جس کے احساس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری زندگی بے تاب کر رکھا تھا۔ آپ ہر لمحہ بے چین رہتے تھے۔ آپ کو نظر آ رہا تھا کہ لوگ پروانوں کی طرح آگ کے گڑھے میں گر رہے ہیں۔ آپ بے تابانہ طور پر ان کی طرف دوڑ پڑتے تھے تاکہ انھیں اس برے انجام سے بچا سکیں۔

اس معاملہ میں یہی احساس آپ کی امت کے ہر فرد کو ہونا چاہیے۔ لوگوں کو چاہیے کہ اس معاملہ میں وہ اتنا زیادہ بے چین ہو جائیں کہ ان کے لیے کسی چیز میں کوئی لذت باقی نہ رہے۔ وہ محسوس کرنے لگیں کہ دوسروں کو اگر انھوں نے جہنم سے بچانے کی کوشش نہ کی تو خود ان کے لیے بھی جہنم سے بچنے کی کوئی امید نہیں۔

جو اسلام یہ کہے کہ ایک آدمی اگر کنویں میں گر رہا ہے تو تم اپنی نماز چھوڑ کر اسے بچانے کے لیے دوڑو، وہی اسلام کیا یہ حکم دے گا کہ جب تک تم سارے مسلمانوں کو نمازی نہ بنالو اس وقت تک اس کے بارے میں کچھ نہ سوچو کہ دنیا کے لوگ اپنی بے خبری کی بنا پر آخرت کے گڑھے میں گر رہے ہیں۔ جس اسلام کی تعلیم یہ ہو کہ معاشی مشغولیت کو چھوڑ کر اندھے کو کنویں سے بچانے کے لیے دوڑو، وہی اسلام کیا یہ حکم دے گا کہ جب تک مسلمانوں کے معاشی حالات درست نہ کرلو اس وقت تک تمہیں اہل دنیا کو ہلاکت سے بچانے کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں، جو اسلام یہ کہے کہ تم اپنا راستہ روک کر اندھے کو بچانے کی کوشش کرو وہی اسلام کیا یہ حکم دے گا کہ جب تک مسلمانوں کے اپنے معاملات درست نہ ہو جائیں انھیں دوسری قوموں کی نجاتِ آخرت کے لیے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

مگر ایسا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے مزید شدت کے ساتھ یہ حکم دیا ہے کہ اہل اسلام دوسروں کی نجات کو خود اپنا مسئلہ بنائیں۔ وہ ترجیح کی بنیاد پر اس دعوتی کام کے لیے سرگرم ہوں۔ حتیٰ کہ اگر ضرورت ہو تو دوسرے کاموں کو چھوڑ کر اس کام کو انجام دیں۔ اہلِ اسلام اگر دوسروں کی نجات کے لیے نہ اٹھیں تو سخت اندیشہ ہے کہ خود ان کی اپنی نجات بھی خدا کے یہاں مشتبہ ہو جائے گی۔

ایک شریف آدمی کسی اندھے کو کنویں میں گرتا ہوا دیکھے تو وہ دیوانہ وار اس کو بچانے کے لیے دوڑ پڑے گا۔ اسی طرح اہلِ اسلام کا فرض ہے کہ وہ جب دیکھیں کہ دنیا کی قومیں زندگی کی حقیقت سے بے خبر ہو کر تباہی کے ابدی گڑھے کی طرف چلی جارہی ہیں تو وہ آخری حد تک تڑپ اٹھیں، وہ ہر مصلحت کو نظر انداز کر دیں اور ہر عذر کو غیر اہم قرار دے کر ہمہ تن اس کے لیے سرگرم ہو جائیں کہ وہ دنیا کی قوموں کو ہدایت کا پیغام پہنچائیں گے، وہ ان کو خدا کی رحمتوں کے سایہ میں جگہ دلانے کے لیے اپنی ساری کوشش صرف کر دیں گے۔

خطرہ اپنے آپ میں اعلان کا تقاضا کرتا ہے۔ ایک آدمی مجمع کے ساتھ چل رہا ہو اور اچانک وہ زہریلے سانپ کو دیکھے تو یہ انسانی نفسیات کے خلاف ہے کہ دیکھنے والا صرف اپنے آپ کو سانپ سے بچانے پر قناعت کر لے اور دوسرے ہم سفر لوگوں کو اس سے

آگاہ نہ کرے۔ یقینی طور پر ایسا ہو گا کہ دیکھنے والا ایک طرف اپنے آپ کو اس سے بچائے گا اور دوسری طرف وہ سانپ، سانپ کے الفاظ میں چیخ پڑے گا تاکہ دوسرے لوگ بھی اس سے بچ جائیں۔

ایک صاحبِ ایمان کا یہ یقین کہ موت کے بعد فوراً قیامت کی ہولناکی کا مسئلہ پیش آنے والا ہے، یہی یقین اس کو مجبور کرے گا کہ وہ ایک طرف اپنے آپ کو اس سے بچانے کی پوری کوشش کرے۔ اور دوسری طرف عین اسی کے ساتھ چیخ کر اعلان کرے کہ اے لوگو، عنقریب تم ایک بھیانک مسئلہ سے دوچار ہونے والے ہو۔ موت سے پہلے اس کی تیاری کر لو تاکہ موت کے بعد اپنے آپ کو اس سے بچا سکو۔

یہی دعوت کی نفسیاتی بنیاد ہے۔ جس طرح ایمان سے یقین کو جدا نہیں کیا جاسکتا اسی طرح یقین سے دعوت کو جدا نہیں کیا جاسکتا۔ جو آدمی یقین سے خالی ہو وہ ایمان سے بھی خالی ہو گا۔ اسی طرح جس آدمی کے اندر دعوت کی تڑپ نہ ہو اس کے اندر یقین کی کیفیت بھی موجود نہ ہوگی۔ یہ ایک اٹل فطری حقیقت ہے۔ اس کے بارے میں شک کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی آدمی زمین و آسمان کے وجود پر شک کرنے لگے۔

واقعاتِ دعوت

عسر میں یسر

قرآن کی سورہ نمبر ۹۴ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ — اور ہم نے تمہارا ذکر بلند کیا (ورفعنا لك ذكرك)

یہ سورہ اسلام کے ابتدائی دور میں مکہ میں اتری۔ اس وقت مکہ کے سردار پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ وہ آپ کا استہزا کرتے۔ آپ کا نام آپ کے دادا نے محمدؐ رکھا تھا مگر آپ کو نیچا دکھانے کے لیے وہ لوگ آپ کو ابن ابی کبشہ کہتے تھے۔ جس کا مطلب تھا فلاں چرواہے کا لڑکا۔ انھوں نے آپ کے خلاف ایسے اشعار بنائے جس میں آپ کو مذمم (مذمت کیا ہوا) بتایا گیا تھا۔ یہ لوگ صبح و شام آپ کو بدنام کرنے میں مشغول رہتے تھے۔

ایسے ناموافق حالات میں کیوں ایسا کہا گیا کہ اللہ نے تمہارا ذکر بلند کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ مکہ کے سردار آپ کو بدنام کر رہے تھے۔ وہ آپ کے بارے میں مخالفانہ پروپیگنڈا کرتے تھے۔ مگر اس واقعہ کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ اس طرح ہر طرف آپ کا چرچا پھیل رہا تھا۔ آپ اور آپ کی دعوت ہر جگہ زیر بحث بن گئی تھی۔ ہر مجلس میں آپ گفتگو اور بحث کا موضوع بنے ہوئے تھے۔

یہ اگرچہ ایک مخالفانہ مہم تھی۔ مگر اس مخالفانہ مہم کے دوران آپ کے حق میں ایک موافق پہلو نکل آیا۔ اور وہ آپ کا اور آپ کی دعوت کا چرچا تھا۔ ان مخالفین نے آپ کی دعوت کو ان وسیع تر حلقوں میں پہنچا دیا جہاں ابھی آپ اپنی براہ راست کوششوں کے ذریعہ نہیں پہنچ سکے تھے۔ مکہ کے اندر اور مکہ کے باہر ہر جگہ لوگ اس کے شائق ہو گئے کہ وہ جانیں کہ محمدؐ کون ہیں، ان کی دعوت کیا ہے۔ وہ کیا بات کہتے ہیں جس کے لوگ اتنے زیادہ مخالف ہو گئے ہیں۔ مخالف پہلو میں موافق پہلو نکل آنے کے اس واقعہ کو قرآن کی مذکورہ سورہ میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے (اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا)

یہ دنیا کا ایک عام قانون ہے کہ یہاں ہر عسر میں یسر چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی ہر ناموافق

واقعہ میں ایک موافق پہلو کا موجود ہونا۔ یہی امکان مزید اضافہ کے ساتھ دعوت حق کی مہم میں موجود ہے۔ جب بھی حق کی دعوت اٹھائی جائے گی یا اسلام کی تعلیمات کو لوگوں کے سامنے لایا جائے گا تو ہمیشہ ایسا ہوگا کہ اس سے کچھ لوگوں کے مفادات پر ضرب پڑے گی، کچھ لوگ اس کو اپنی برتری کے لیے ایک چیلنج سمجھیں گے۔ ایسے لوگ اس کے خلاف ہو جائیں گے اور جواب میں مخالفانہ مہم شروع کر دیں گے۔ یہ واقعہ اسلام کے دور اول میں پیش آیا اور بعد کو بھی پیش آئے گا۔

مگر اس قسم کی مخالفانہ مہم اسلام کے داعیوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ ان کے لیے ایک معاون مہم کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ مخالفین یہ کرتے ہیں کہ دعوت کو عمومی چرچے کا موضوع بنا دیتے ہیں، ہر جگہ اس کے بارے میں لکھا اور بولا جانے لگتا ہے۔ اس عمومی چرچے کے ذریعہ مخالفین دعوت کو اس مقام تک پہنچا دیتے ہیں جہاں اس کے داعی ابھی تک اس کو نہیں پہنچا سکے تھے۔ اس طرح لوگ وسیع پیمانہ پر یہ جان لیتے ہیں کہ یہاں ایک اور نقطۂ نظر بھی ہے اور انھیں اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیے۔

یہ انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ محض پروپیگنڈا کی بنیاد پر رائے نہ قائم کرے بلکہ اصل معاملہ کو براہ راست طور پر خود جاننے کی کوشش کرے۔ انسان کی یہ فطرت دعوتی مہم کے حق میں ایک زبردست مددگار کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں اس کے کرشمے ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً موجودہ زمانہ میں سلمان رشدی کی کتاب سیٹنک ورسز کے بعد یہ واقعہ بہت بڑے پیمانہ پر رونما ہوا۔

سلمان رشدی کی کتاب اسلام کے خلاف ایک نہایت بے ہودہ کتاب تھی۔ حتی کہ نعوذ باللہ اس میں دکھایا گیا تھا کہ قرآن میں کچھ "سیٹنک ورسز" شامل ہو گئیں۔ مگر یہ اس واقعہ کا ایک پہلو تھا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ اس کتاب نے عالمی سطح پر اسلام کو غور و بحث کا موضوع بنا دیا۔ لوگ اسلام کے بارے میں از سر نو جاننے کے شائق ہو گئے۔ ایک رپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں سیٹنک ورسز کی جتنی کاپیاں فروخت ہوئیں، اس کے مقابلہ میں سو گنا زیادہ قرآن کے ترجمے اور قرآنی لٹریچر فروخت ہوا۔

اہلِ مکہ کا قبولِ اسلام

اسلام کا آغاز ۶۱۰ء میں ہوا۔ جب کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ میں پہلی وحی اتری۔ اس وقت ساری دنیا میں صرف ایک مسلم تھا اور وہ پیغمبر اسلامؐ کی اپنی ذات تھی۔ اس کے کچھ دنوں بعد آپ کی ملاقات ابو بکر ابن ابی قحافہؓ سے ہوئی۔ آپ نے ان کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی۔ وہ نہایت سلیم الطبع آدمی تھے، انھوں نے فوراً ہی آپ کے پیغام کی صداقت کو پالیا اور باقاعدہ طور پر اسلام میں داخل ہو گئے۔

اسی زمانے کا واقعہ ہے۔ باہر کے کسی عرب قبیلہ کا ایک شخص مکہ آیا۔ وہ جب اپنے قبیلہ میں واپس گیا اور قبیلہ والوں نے اس سے مکہ کے حالات پوچھے تو اس نے مکہ کی نئی خبر کے طور پر انھیں یہ بات بتائی: محمدٌ تنبّأ وتبعہ ابن ابی قحافۃ (محمدؐ نے نبوت کا دعوی کیا ہے اور ابو قحافہ کا لڑکا ان کا ساتھ دے رہا ہے)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تیرہ سال رہے۔ مکہ کے ابتدائی زمانہ میں اسلام کی تصویر لوگوں کی نظر میں یہ تھی کہ یہ صرف دو آدمیوں کا ایک قافلہ ہے۔ مگر نبوت کے تیرھویں سال جب آپ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو مکہ کے تقریباً دو سو افراد یا تو اسلام میں داخل ہو چکے تھے یا اس سے گہرے طور پر متاثر تھے۔ مزید یہ کہ یہ دو سو آدمی عام قسم کے لوگ نہ تھے۔ ان میں سے ایک ایک شخص ہیروانہ کردار کا حامل تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اسلامی انقلاب میں تاریخ ساز کردار ادا کیا۔

یہ اعلیٰ انسانیت کے حامل افراد کس طرح حاصل ہوئے۔ اس کا جواب صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ دعوت کے ذریعہ۔ سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں پیغمبر اسلام کا صرف ایک کام تھا اور وہ دعوت و تبلیغ ہے۔ آپ مسلسل لوگوں سے ملاقاتیں کرتے، ان کی مجالس میں جا کر انھیں اسلام کا پیغام پہنچاتے۔ مکی دور کے حالات میں بار بار اس طرح کے الفاظ آتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور ان کو قرآن کا کوئی حصہ پڑھ کر سنایا (فعرض علیہم الاسلام وتلا علیہم القرآن)

مکہ میں کعبہ تھا جو تمام عرب قبیلوں کے لیے محترم حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ ملک کے مختلف حصوں سے لوگ کعبہ کی زیارت کے لیے مکہ آتے اور وہاں اپنے خیمے لگاتے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ آپ ان کی مجلسوں میں جاتے اور ان کے سامنے دلنشیں انداز میں اسلام کا پیغام پہنچاتے۔ مثلاً آپ ان سے یہ کہتے کہ: ایہا الناس قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا (اے لوگو کہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، تم فلاح پاؤ گے)

مکہ میں پیغمبر اسلامؐ اس طرح لوگوں کو حق کی طرف بلاتے رہے۔ لوگ ایک ایک کرکے اسلام قبول کرنے لگے۔ جو آدمی اسلام میں داخل ہوجاتا وہ خود بھی اس کا داعی بن جاتا۔ وہ اپنے حلقہ میں اور اپنے ملنے والوں میں اسلام کا پیغام پہنچاتا۔ اس طرح اسلام کی دعوت اپنی فطری رفتار سے مکہ میں پھیلنے لگی۔

کچھ لوگ جو اپنے مزاج کے اعتبار سے زیادہ سنجیدہ تھے وہ فوراً ہی اسلام کے حلقہ میں داخل ہوگئے۔ مثلاً حضرت خدیجہؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ وغیرہ۔ ان لوگوں کے سامنے اسلام کی دعوت صرف ایک بار پیش کی گئی اور انھوں نے فوراً ہی اس کو قبول کرلیا۔ گویا کہ وہ امکانی طور پر پہلے ہی مسلم تھے اور اب واقعہ کے طور پر مسلم بن گئے۔

کچھ لوگ اپنے مزاج کے اعتبار سے سخت تھے۔ انھوں نے بھی اسلام قبول کیا مگر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد انہی میں سے ایک عمر ابن الخطابؓ تھے۔ وہ نہایت اعلیٰ صلاحیت کے آدمی تھے، اسی کے ساتھ ان کے مزاج میں سختی بھی تھی۔ شروع میں وہ اسلام کی مخالفت کرتے رہے۔ ان کے مخالفانہ رویہ کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ، تو عمر ابن الخطاب یا عمرو بن ہشام کے ذریعہ اسلام کو طاقت دے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے اسلام کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے توحید کی بات ان کی سمجھ میں نہ آئی، وہ اس کے مخالف بن گئے۔ پھر دھیرے دھیرے وہ اپنے آبائی مذہب کے بارے میں تذبذب کا شکار ہوگئے۔ آخر میں جب انھوں نے دیکھا کہ اسلام خود ان کے گھر میں داخل ہوگیا تو انھوں نے کھلے ذہن کے ساتھ قرآن کو پڑھا۔ یہ مطالعہ ان کے لیے حق کی دریافت بن گیا۔

مدعو کے لیے دعا

اسلام کے ابتدائی دور کا واقعہ ہے۔ طفیل ابن عمرو الدوسی مکہ آئے۔ انھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن کی آیتیں سنیں، وہ اس سے متاثر ہوئے اور اسلام قبول کر لیا۔

اس کے بعد وہ اپنے قبیلہ دوس میں واپس گئے۔ انھوں نے قبیلہ کے لوگوں کو دینِ توحید کی طرف بلانا شروع کیا، مگر ان لوگوں نے سرکشی کی اور نئے دین کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ایک عرصہ کے بعد طفیل ابن عمرو دوبارہ مکہ آئے، انھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ اے خدا کے رسولؐ، قبیلہ دوس سرکش ہو گیا ہے، آپ اس کے خلاف بد دعا کیجیے۔ اس کے بعد آپ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا تو آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: اللّٰھُمَّ اھدِ دَوْسًا، اللّٰھُمَّ اھدِ دَوْسًا (اے اللہ تو قبیلہ دوس کو ہدایت دے، اے اللہ تو قبیلہ دوس کو ہدایت دے)

اس کے بعد آپ طفیل ابن عمرو کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے کہا کہ "اپنی قوم کی طرف واپس جاؤ، ان کو دینِ حق کی طرف بلاؤ اور ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کرو" (ارجع الی قومك فادعُھم وارفُق بھم) سیرت ابن ہشام ۱/۴۰۹

روایات بتاتی ہیں کہ اس کے بعد طفیل ابن عمرو الدوسی دوبارہ اپنے قبیلے کی طرف واپس گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت کے مطابق، انھوں نے اپنے قبیلے کو نرمی اور شفقت کے ساتھ اسلام کی طرف بلایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے قبیلے نے اسلام قبول کر لیا۔ حضرت ابوہریرہ اسی قبیلۂ دوس سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک مہربان باپ اپنے بیٹے کو سرکشی کرتا ہوا دیکھے تب بھی وہ اس کے خلاف بد دعا نہیں کرے گا۔ وہ صرف یہ کرے گا کہ بیٹے کی ہدایت کے لیے خدا سے دعا کرے اور اس کی اصلاح کے لیے اپنی ممکن کوششوں کو جاری رکھے۔ یہی معاملہ داعی کا ہے۔ داعی وہ ہے جو اپنے مدعو کے حق میں وہ شفقت رکھتا ہو جو باپ کے دل میں اپنے بیٹے کے لیے ہوتی ہے۔ وہ ہر حال میں اور آخر وقت تک اپنے مدعو کی ہدایت کا حریص بنا رہے۔ خواہ مدعو نے اس

کے خلاف کتنی ہی زیادتیاں کی ہوں۔

دعوت کسی داعی کا ذاتی عمل نہیں۔ وہ خدا کے حکم کی تعمیل ہے۔ وہ بندوں کے حق میں خدا کی نمائندگی ہے۔ ایسی حالت میں مدعو کے خلاف بد دعا کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس معاملہ میں داعی کا کردار صرف یہ ہے کہ وہ مدعو کے رویہ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اس کو خدا کا پیغام پہنچائے اور آخر وقت تک پہنچاتا رہے۔ وہ مدعو کے انجام کو پوری طرح خدا کے اوپر چھوڑ دے۔ داعی کا کام صرف دعوت دینا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہے وہ تمام تر خدا کا معاملہ ہے اور وہی اپنی حکمت کے تحت جیسا چاہے گا ویسا فیصلہ کرے گا۔

حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے ایک صحابی کو دعوتی مشن پر بھیجتے ہوئے کہا کہ تمہاری دعوت سے ایک آدمی کا ہدایت پالینا تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوت کا معاملہ مدعو سے پہلے خود داعی کا معاملہ ہے۔ داعی کے لیے یہ ایک نفع بخش تجارت کی حیثیت رکھتا ہے۔ کوئی تاجر کبھی اپنے گاہک کے خلاف بد دعا نہیں کرتا۔ وہ آخری حد تک اس کے لیے پر امید رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ موافقانہ جذبہ کے تحت اس کے لیے اپنی کوشش جاری رکھتا ہے۔

یہی معاملہ داعی کا ہے۔ داعی کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ دعوت کا عمل کرکے وہ اپنے آپ کو خدا کے انعام کا مستحق بنائے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی دعوتی مہم اگر صرف کوشش کے درجہ میں رہی تب بھی اس کو کوشش کا بھرپور اجر ملے گا۔ اور اگر وہ مدعو کے دل میں ہدایت کی روشنی داخل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ خدا کی نظر میں دُہرے اجر کا مستحق بنے گا۔ یہ احساسات داعی کو اپنے مدعو کے حق میں لامحدود حد تک پُر امید بنا دیتے ہیں۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میرا فائدہ اپنے عمل کو جاری رکھنے میں ہے۔ اس لیے مجھے صرف دعا کرنا چاہیے۔ مدعو اگر بالفرض ہدایت قبول نہ کرے تو یہ خدا کے اوپر ہے کہ وہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرے گا۔ یہ میرے دائرہ کی چیز نہیں۔

بد دعا داعی کی زبان نہیں، بد دعا داعی کا طریقہ نہیں۔ یہ بدخواہ کی زبان ہے، اور داعی اپنے مدعو کا خیر خواہ ہوتا ہے نہ کہ بدخواہ۔

سچائی کی طاقت

مکی زندگی کے آخری زمانے میں مدینہ کے کچھ لوگ آپ کے پاس آئے اور اسلام قبول کرلیا۔ جب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہوئے تو ان میں کا ایک شخص اٹھا۔ یہ عباس بن عبادہ بن نضلہ انصاری تھے۔ انھوں نے کہا کہ اے قبیلہ خزرج کے لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ تم اس آدمی سے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو۔ انھوں نے کہا ہاں! کہا کہ تم تمام سرخ وسفید کے خلاف جنگ پر بیعت کر رہے ہو۔ اس میں تمہارے اموال برباد ہوں گے اور تمہارے بہترین افراد قتل کیے جائیں گے:

قالوا فانا ناخذہ علی مصیبة الاموال وقتل الاشراف فما لنا بذالك یا رسول اللہ ان نحن وَفینا قال الجنة۔ قالوا اُبسط یدك فبسط یدہ فبایعوہ۔

(سیرۃ ابن ہشام، الجزء الثانی ۵۵)

انھوں نے کہا کہ ہم پھر ان کو اموال کی ہلاکت اور افراد کے قتل کے باوجود قبول کرتے ہیں۔ پھر اے خدا کے رسول ہمارے لیے کیا ہے اگر ہم اس کو پورا کر دیں۔ آپ نے فرمایا جنت۔ انھوں نے کہا کہ ہاتھ بڑھائیے آپ نے ہاتھ بڑھایا اور پھر انھوں نے بیعت کی۔

مدینہ کے لوگوں نے اسلام پر جس وقت یہ بیعت کی اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی مادی یا سیاسی چیز نہ تھی۔ آپ کے پاس صرف ایک چیز تھی اور وہ سچائی تھی، یہ سچائی بھی صرف کچھ الفاظ کی صورت میں تھی نہ کہ عملی نوعیت کی کسی دکھائی دینے والی چیز کی صورت میں۔ اس کے باوجود مدینہ کے ان لوگوں نے یہ جانتے ہوئے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلی کہ اس کے نتیجے میں انھیں قوموں سے لڑنا پڑے گا۔ انھیں اپنی جان و مال کو ہلاک کرنا ہوگا، اور آخر میں انھیں جو چیز ملے گی وہ موت کے بعد سامنے آنے والی جنت ہے۔

یہ سچائی کا کرشمہ تھا۔ سچائی اپنے آپ میں طاقت ہے۔ وہ اپنی فکری اور نظریاتی حیثیت ہی میں یہ تاثیر رکھتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں کو مسخر کر سکے۔ وہ لوگوں کو آمادہ

کرے کہ وہ قربانی کی قیمت پر اس کا ساتھ دیں۔ وہ ہر قسم کا نقصان برداشت کرتے ہوئے اس کو قبول کر لیں۔

تاہم اسلام کی سچائی کو قبول کرنے کے بعد جنگ کا پیش آنا کوئی لازمی چیز نہیں۔ سچائی بہر حال قربانی مانگتی ہے مگر یہ قربانی حالات کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ انسان کبھی اس کو ایک قسم کی قربانی کی قیمت پر قبول کرتا ہے اور کبھی دوسری قسم کی قربانی کی قیمت پر۔

قدیم زمانہ مذہبی جبر کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں شرک کا عقیدہ سیاسی اقتدار کا سرچشمہ بنا ہوا تھا۔ اس لیے اہلِ توحید کو حکمرانوں کی طرف سے ظلم و زیادتی کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ مگر اب مذہبی آزادی کا زمانہ ہے اس لیے اب اہلِ توحید کے لیے سیاسی ظلم کا زمانہ بھی ختم ہو گیا۔

اب حق کو قبول کرنے کے لیے جن چیزوں سے لڑنا ہے وہ آدمی کا خود اپنا نفس ہے۔ حق کو قبول کرنے میں آدمی کی خواہشوں پر چوٹ پڑتی ہے۔ اس سے مالی مفادات متاثر ہوتے ہیں۔ اس سے دنیوی مصلحتوں کا نظام درہم برہم ہوتا ہے۔ اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ آدمی دنیا کے فائدوں کے مقابلے میں آخرت کے فائدوں کو ترجیح دے۔

یہ سب بلاشبہ انسان کے لیے نہایت مشکل چیزیں ہیں لیکن جس آدمی پر حق منکشف ہو جائے اس کے لیے حق ہی سب سے بڑی چیز بن جاتی ہے۔ وہ ہر نقصان کو گوارہ کرتے ہوئے کھلے دل کے ساتھ حق کو قبول کر لیتا ہے۔

اسلام کی تاریخ میں اس طرح کے واقعات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ہر زمانہ میں ایسا ہوا کہ بہت سے لوگوں نے اسلام کو صرف اس لیے قبول کیا کہ انھوں نے اس کو اپنے دل کی آواز پایا، آج بھی کثیر تعداد میں لوگ ایسا کر رہے ہیں۔

سچائی اپنی ذات میں ایک طاقت ہے، وہ اپنے آپ دلوں میں نفوذ کرتی ہے۔ تاریخ اس اصول کی مسلسل تصدیق کر رہی ہے۔

اختلاط سے تبلیغ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تو ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اب مکہ کے سرداروں نے آپ کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ مکہ اور مدینہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف برسر جنگ ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں پُرامن ماحول میں ملنا جلنا بند ہو گیا۔ اب دونوں کی ملاقات کا واحد مقام میدانِ جنگ بن گیا۔ ایسے ماحول میں دعوت و تبلیغ کا کام نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ہجرت کے بعد دعوت کا عمل تقریباً ختم ہو گیا۔

اس دعوتی عمل کو دوبارہ کھولنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نئی تدبیر اختیار فرمائی۔ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ عمرہ کے ارادہ سے مکہ سے نکلے۔ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو مکہ کے سرداروں نے آپ کو روک دیا۔ اس وقت دونوں فریقوں کے درمیان بات چیت شروع ہو گئی۔ اس بات چیت کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے سرداروں کی شرطوں کو یک طرفہ طور پر مانتے ہوئے ان سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر لیا۔ اب یہ طے ہو گیا کہ اگلے دس سال تک دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف کوئی جنگی کارروائی نہیں کریں گے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے مدینہ واپس آ گئے۔

اس معاہدہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں فریقوں کے درمیان جنگ اور ٹکراؤ کا ماحول ختم ہو گیا اور اس کی جگہ پُرامن ماحول قائم ہو گیا۔

پُرامن حالات ہمیشہ اسلامی دعوت کے لیے انتہائی مددگار ہوتے ہیں چنانچہ جیسے ہی دونوں فریقوں کے درمیان امن کے حالات پیدا ہوئے اور لوگ معتدل انداز میں ایک دوسرے سے ملنے لگے تو اسی کے ساتھ دعوت کا بند عمل بھی دوبارہ جاری ہو گیا۔ مشہور تابعی ابن شہاب الزہری کہتے ہیں: اسلام میں سب سے بڑی فتح حدیبیہ تھی جس کو قرآن میں فتح مبین کہا گیا ہے۔ اس سے پہلے لوگ صرف جنگ میں ایک دوسرے سے ملتے تھے۔

پھر جب صلح حدیبیہ ہوگئی تو جنگ کا خاتمہ ہوگیا اور لوگوں نے ہتھیار رکھ دیے اور لوگ ایک دوسرے سے امن میں ہوگئے۔ اس کے بعد ایک اور دوسرے کے درمیان بات چیت ہونے لگی۔ اب مومن اور غیر مومن معتدل حالات میں ایک دوسرے سے ملنے لگے اور اسلام پر باتیں کرنے لگے۔ پھر جب بھی کوئی شخص اسلام پر بات کرتا تو وہ اس کو سمجھ لیتا اور وہ اسلام میں داخل ہو جاتا۔ اس طرح دو سال میں اتنے زیادہ لوگ اسلام میں داخل ہوئے جو اس سے پہلے پوری مدت میں نہیں ہوئے تھے (سیرۃ ابن کثیر ۳/۳۲۴)

یہ دعوتی معاملہ اسلام کی پوری تاریخ میں جاری رہا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اسلام کی بعد کی صدیوں میں مکی دور جیسی دعوتی مہم دوبارہ بہت کم کی جا سکی۔ مگر اسلام کی اشاعت مسلسل اتنی تیزی کے ساتھ بڑھتی رہی کہ آج ساری دنیا میں اہلِ اسلام کی تعداد ایک بلین سے زیادہ ہو چکی ہے۔ اسلام کی یہ عالمی اشاعت زیادہ تر اختلاط کے ذریعہ وجود میں آئی۔

اسلام کے ماننے والے جب اپنے وطن سے نکل کر مختلف ملکوں میں پھیلے تو قدرتی طور پر دوسری قوموں کے ساتھ ان کا اختلاط ہونے لگا۔ اس اختلاط کے دوران فطری طور پر ایسا ہوا کہ اسلام کی تعلیمات زیرِ بحث آنے لگیں۔ لوگوں کو موقع ملا کہ وہ اسلام اور غیرِ اسلام کے فرق کو جانیں، اور دونوں کے درمیان آزادانہ تقابل کر سکیں۔ اس طرح اختلاط بذاتِ خود دعوتِ عام کا ذریعہ بن گیا۔

مولانا سید حسین احمد مدنی نے اپنے ایک مکتوب میں صلح حدیبیہ کا فائدہ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ "آپس میں اختلاط کا ہونا، نفرت میں کمی آنا، مسلمانوں کے اخلاق اور ان کی تعلیمات کا معائنہ کرنا، دلوں سے ہٹ اور ضد کا اٹھ جانا، یہی امور تھے جنھوں نے قریش کے لختِ جگر کو کھینچ کھینچ کر صلح حدیبیہ کے بعد اسلام میں داخل کر دیا (مکتوبات شیخ الاسلام ۱/۱۴۶)

وہ لکھتے ہیں کہ اختلاط باعثِ عدم تنافر ہے، اور وہ اقوام کو اسلام کی طرف لانے والا ہے۔ اور تنافر باعثِ ضد اور ہٹ اور عدم اطلاع علی المحاسن ہے۔ اور وہ اسلامی ترقی میں سدِ راہ ہونے والا ہے۔ اس لیے اگر ہمسایہ قومیں ہم سے نفرت کریں تب بھی ہم کو نفرت نہ کرنا چاہیے۔

مدینہ میں اسلام

مکہ کے بعد اسلامی دعوت کا دوسرا مرکز مدینہ تھا۔ ہجرت سے کچھ پہلے مکہ کے دو مسلمان (حضرت مصعب بن عمیرؓ اور عبد اللہ بن ام مکتومؓ) مدینہ بھیجے گئے۔ یہ لوگ وہاں کے لوگوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر قرآن کے حصے پڑھ کر سناتے تھے۔ اس لیے ان کو مُقری کہا جاتا تھا یعنی پڑھ کر سنانے والا۔ مدینہ کے لوگ سادہ مزاج تھے وہ اپنی فطرت پر قائم تھے۔ چنانچہ وہ قرآن کو سن سن کر اسلام قبول کرنے لگے تھے۔

اُسید ابن حضیر مدینہ کے ایک سردار تھے۔ ان کو اس دعوتی سرگرمی کی خبر ہوئی تو وہ تلوار لے کر اس مجلس میں پہنچے جہاں قرآن سنایا جا رہا تھا۔ انھوں نے غصہ کے ساتھ کہا کہ تم لوگ یہاں اس لیے آئے ہو کہ ہمارے بچوں اور ہماری عورتوں کو بہکاؤ، اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو یہاں سے واپس چلے جاؤ۔ مصعب بن عمیر نے ٹھنڈے طریقہ سے جواب دیا کہ پہلے آپ تھوڑی دیر بیٹھ کر ہماری بات سنیں اس کے بعد آپ جو فیصلہ کریں وہ ہم کو منظور ہوگا۔ اُسید ابن حضیر نے کہا کہ تم نے انصاف کی بات کہی اور پھر سننے کے لیے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد مصعب بن عمیر نے قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر انھیں سنایا، اسید ابن حضیر خاموشی کے ساتھ سنتے رہے اور اس کے بعد کہا: ما احسن هذا الكلام واجمله (یہ کلام کتنا عمدہ اور کتنا اچھا ہے)

مزید گفتگو کے بعد اسید ابن حضیر نے پوچھا کہ اس دین میں داخل ہونے کا طریقہ کیا ہے۔ مصعب ابن عمیر نے کہا کہ آپ غسل کرکے اپنے آپ کو پاک کرلیں اور اس کے بعد کلمۂ شہادت ادا کرکے دینِ توحید میں داخل ہو جائیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد وہ واپس گئے اور مدینہ کے دوسرے سردار سعد ابن معاذ کو بھیجا۔ سعد بن معاذ جب مجلس میں آئے تو انھوں نے بھی ابتداءً سخت گفتگو کی۔ مصعب بن عمیر نے کہا کہ آپ فیصلہ کرنے سے پہلے ہماری بات سنیں، اس کے بعد فیصلہ فرمائیں۔ سعد بن معاذ نے کہا کہ تم نے انصاف کی بات کہی اور پھر خاموشی کے ساتھ مجلس میں بیٹھ گئے۔ مصعب بن عمیر نے

قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا تو وہ ان کے دل میں اتر گیا۔ قرآن کا سننا ان کے لیے حقیقت کی دریافت کے ہم معنی بن گیا۔ چنانچہ انھوں نے بھی اسی مجلس میں اسلام قبول کر لیا۔

اس طرح مکہ سے آنے والے مُقری مدینہ کے لوگوں کو قرآن سناتے اور ان سے دعوتی گفت گو کرتے۔ یہ مہم کامیاب رہی اور اسلام پورے مدینہ میں اس طرح پھیل گیا کہ وہاں کا ایک گھر بھی نہ بچا جس میں اسلام داخل نہ ہو گیا ہو (فلم تبق دار من دور الانصار الا اسلم اهلها) سیرۃ ابن ہشام، ج ۲ ص ۱۱۸

اس طرح مدینہ میں اسلام تیزی کے ساتھ پھیلتا رہا یہاں تک کہ مدینہ کی پوری آبادی اسلام میں داخل ہو گئی۔ ان لوگوں نے ہر اعتبار سے اسلام اور مسلمانوں کی مدد کی، چنانچہ وہ خصوصی طور پر انصار کہے جانے لگے۔ مدینہ اسلام کی تاریخ میں اسلام کا پہلا مرکز بنا۔ یہیں اسلام کی پہلی اسٹیٹ وجود میں آئی اور یہ سب کچھ پُرامن دعوت کے ذریعہ ہوا۔

مدینہ والوں میں اسلام کس طرح پھیلا اور ان کے سامنے اسلام کی دعوت کس طرح پیش کی گئی۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے۔ مدینہ کے ایک صاحب رفاعہ بن رافع اپنا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :

چھ انصار کے آنے سے پہلے میں اور میرا خالہ زاد بھائی معاذ بن عفراء مکہ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ آپؐ نے ہمارے سامنے اسلام پیش کیا۔ اور یہ فرمایا اے رفاعہ، بتاؤ آسمان اور زمین اور پہاڑوں کو کس نے پیدا کیا۔ ہم نے کہا اللہ نے، آپؐ نے فرمایا۔ خالق عبادت کا مستحق ہے یا مخلوق۔ ہم نے کہا خالق، آپ نے فرمایا کہ پس کیا بُت اس کے مستحق ہیں کہ تم ان کی عبادت کرو یا خدا اس کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے کیونکہ بُت تو تمہارے بنائے ہوئے ہیں۔ جب کہ خدا خالق ہے اور اس نے سب کو بنایا ہے۔ میں تم کو ایک خدا کی عبادت کی دعوت دیتا ہوں۔ تم خدا کو ایک مانو اور صرف اسی کی عبادت کرو اور مجھ کو خدا کا رسول اور نبی مانو۔ صلہ رحمی کرو۔ ظلم اور تعدی کو چھوڑ دو۔ میں نے کہا بے شک آپ نے بلند امور اور پاکیزہ اخلاق کی طرف بلایا ہے۔ میں آپ کے پاس سے اٹھ کر حرم میں پہنچا اور پکار کر یہ کہا : اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ۔

تبلیغ عام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کے آخری زمانہ میں اپنے اصحاب کو اکٹھا کیا اور ان سے کہا کہ اے لوگو، اللہ نے مجھ کو تمام انسانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ پس تم میری طرف سے تمام لوگوں کو پہنچا دو، اور اس معاملہ میں باہم اختلاف نہ کرو جیسا کہ مسیح کے حواریوں نے اختلاف کیا (سیرۃ ابن ہشام ۴/۲۸۷)

چنانچہ اس کے بعد آپ کے اصحاب نکل نکل کر باہر جانے لگے۔ دھیرے دھیرے وہ عرب میں اور عرب کے باہر دوسرے ملکوں میں پھیل گئے۔ اسی بنا پر ایسا ہے کہ مکہ اور مدینہ میں بہت کم اصحاب کی قبریں ہیں۔ یہ لوگ دعوت و تبلیغ کا کام کرتے ہوئے مختلف ملکوں میں وفات پا گئے اور وہیں ان کی قبریں بنیں۔ یہ لوگ ان ملکوں میں معاش کے حصول کے لیے مزدوری یا معمولی تجارت کرتے تھے اور جو وقت بچتا وہ تبلیغ کے کام میں لگاتے تھے۔

یہ تبلیغ براہ راست بھی ہوتی تھی اور بالواسطہ بھی۔ یعنی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ وہ لوگوں کی مجلسوں میں جا کر انھیں اسلام کی بات بتاتے اور کبھی ملاقات اور اختلاط کے دوران جب کوئی شخص سوال کرتا تو وہ اس کو قرآن کا کوئی حصہ سناتے۔ اس تبلیغی عمل کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہر جگہ کی زبانیں سیکھیں۔ چنانچہ وہ جن ملکوں میں گئے انھوں نے وہاں کی زبانیں سیکھیں اور پھر ان کی زبان میں دین کی باتیں بتائیں۔

وہ علاقہ جس کو آج عرب دنیا کہا جاتا ہے اور عربی زبان جس کی مشترک زبان ہے وہ اسلام سے پہلے ایسا نہ تھا۔ اُس وقت شام کی زبان سُریانی، مصر کی زبان قبطی، فلسطین کی زبان عبرانی، لیبیا کی زبان بربری تھی، وغیرہ۔ مگر آج اس پورے علاقہ کی زبان عربی ہے۔ ان سب کا کلچر عرب کلچر بن چکا ہے۔ یہ انقلاب دور اول میں صحابہ اور تابعین کے ذریعہ پیش آیا۔ ان لوگوں نے ابتداءً ان کی زبانیں سیکھ کر ان میں اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ دھیرے دھیرے وہ اسلام میں داخل ہونا شروع ہوئے، اسی کے ساتھ ان کی زبان اور ان کے کلچر میں تبدیلی آنے لگی۔ یہاں تک کہ پورے علاقہ کی زبان عربی زبان ہو گئی اور ان کا کلچر عرب کلچر بن گیا۔

صحابہ اور تابعین جب مختلف ملکوں میں داخل ہوئے تو تبلیغ کا عمل بھی فطری طور پر جاری ہو گیا۔ ان کا آنا عملی طور پر مبلغین کا آنا بن گیا۔ خود ان کا وجود اس بات کی ضمانت بن گیا کہ وہ جہاں ہوں وہاں اسلام کا تعارف ہو اور لوگ اسلام سے آشنا ہو کر اس کے دائرہ میں داخل ہوتے چلے جائیں۔

یہ لوگ جن ملکوں میں گئے وہاں انھوں نے مقامی باشندوں سے کسی قسم کی نزاع قائم نہیں کی۔ ہر جگہ وہ پُر امن پڑوسی بن کر رہنے لگے۔ وہ سماج کے ہر اس معاملہ سے الگ رہے جو ان کے اور مقامی باشندوں کے درمیان نزاع پیدا کرنے والا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا وجود صرف ایک بات کو زیر بحث لانے کا ذریعہ بن گیا اور وہ اسلامی دعوت کی بات تھی۔

وہ جس مقام پر ہوتے وہاں وہ اپنے مذہب کے مطابق پانچ وقت کی نماز ادا کرتے۔ مقامی باشندوں کے لیے یہ نماز بالکل نئی چیز تھی۔ چنانچہ اکثر وہ نماز کے بارے میں سوال کرتے۔ جب یہ مسلمان ان سے نماز کی تشریح کرتے تو ان کو وہ بہت پسند آتی یہاں تک کہ بہت سے لوگ صرف نماز کو دیکھ کر اسلام میں داخل ہو گئے۔

صحابہ اور تابعین جب اس طرح مختلف ملکوں میں داخل ہوئے تو اس کی وجہ سے فطری طور پر ایسا ہوا کہ اسلام ہر جگہ بحث کا موضوع بن گیا۔ اسلام کا عقیدہ، اسلام کی عبادت، اسلام کا اخلاق، حتیٰ کہ اسلام کے مطابق سلام کرنے کا طریقہ اور مختلف مواقع پر اسلام کی دعائیں ہر چیز سوال و جواب کا موضوع بن گئی۔ اس طرح مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اختلاط بذاتِ خود تبلیغ کا ذریعہ بن گیا۔

انسان جب کسی ایسی چیز کو دیکھتا ہے جو اس کی معلومات یا اس کی مانوس فکر سے مختلف ہے تو یہ فرق اس کے لیے تجسس کا ذریعہ بن جاتا ہے وہ اس فرق کا سبب جاننے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ یہی اس زمانہ میں پیش آیا۔ لوگ اپنے اور صحابہ و تابعین کے درمیان مختلف قسم کے فرق کا مشاہدہ کرتے، پھر اس فرق کو جاننے کی کوشش کرتے تھے۔ اس طرح فرق کا پایا جانا بڑے پیمانے پر تبلیغ و دعوت کا ذریعہ بن گیا۔ یہاں تک کہ ملک کے ملک اور قومیں کی قومیں اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئیں۔

سوال وجواب

دعوت ابتدائی مرحلہ میں یک طرفہ ہوتی ہے۔اس کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ وہ دوطرفہ بن جاتی ہے۔یعنی داعی کو پہلے یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک ایک شخص سے مل کر اسے دعوت پہنچائے۔مگر جب اس کا عمومی چرچا ہو جاتا ہے تو لوگ خود آ آ کر داعی سے اس کی تحقیق کرتے ہیں اور اپنا قلبی اطمینان حاصل کرکے دینِ حق کو اپنا دین بنا لیتے ہیں۔اس سلسلہ میں اسلام کے دور اول میں پیش آنے والے واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو ۵ھ میں مدینہ میں پیش آیا۔اس کی تفصیل یہ ہے:

قبیلہ بنوسعد بن بکر نے ضمام بن ثعلبہ کو اپنا سفیر بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھیجا۔اس نے مسجد کے دروازے پر پہنچ کر اپنے اونٹ کو بٹھایا اور اس کی اگلی ٹانگ کو باندھ دیا۔پھر وہ مسجد میں داخل ہوا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے قریب آکر پوچھا کہ آپ میں سے ابن عبدالمطلب کون ہے؟ رسول اللہؐ نے جواب دیا کہ ابن عبدالمطلب میں ہوں۔پھر اس نے آپؐ سے پوچھا کہ آپ ہی محمدؐ ہیں؟ اس کے جواب میں رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "ہاں، میں ہی محمدؐ ہوں"۔ پھر وہ شخص بولا کہ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ سے چند سوالات پوچھوں۔رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "جو دل میں آئے پوچھو، میں برا نہیں مانوں گا"۔ اس پر اس شخص نے کہا کہ "میں آپ کو قسم دیتا ہوں اللہ کی جو آپ کا خدا ہے اور ان لوگوں کا خدا ہے جو آپ سے پہلے گزرے ہیں اور آپ کے بعد آنے والے ہیں، کیا واقعی اللہ نے آپ کو ہماری طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟"

رسول اللہؐ نے جواب میں فرمایا "ہاں، قسم ہے اللہ کی"۔ پھر وہ شخص بولا "میں آپ کو قسم دیتا ہوں اللہ کی جو آپ کا خدا ہے اور ان لوگوں کا خدا ہے جو آپ سے پہلے گزرے ہیں اور آپ کے بعد آنے والے ہیں، کیا واقعی اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے اس بات کا کہ ہم صرف اسی کو پوجیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں؟ اور ان بتوں کو چھوڑ دیں جن کو ہمارے باپ دادا پوجا کرتے تھے؟"

رسول اللہؐ نے جواب میں فرمایا "ہاں، قسم ہے اللہ کی"۔ پھر اس شخص نے تمام فرائضِ اسلام مثلاً نماز، زکوۃ اور حج وغیرہ کے متعلق یکے بعد دیگرے پوچھا اور ہر بار رسول اللہؐ کو قسم دلائی۔ اور پھر آخر میں کہا کہ "میں گواہی دیتا ہوں اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ میں تمام احکام کی پیروی کروں گا، اور جن باتوں سے آپ نے روکا ہے، ان سے پرہیز کروں گا اور ان میں ذرہ بھر کمی بیشی نہیں کروں گا۔

پھر ضمام رخصت ہوا اور اپنے قبیلہ میں چلا گیا۔ جب اس کے قبیلے والے جمع ہوئے تو سب سے پہلی بات جو ضمام نے ان سے کہی یہ تھی کہ "لات اور عزیٰ بے کار چیزیں ہیں"۔ اس پر اہل قبیلہ پکار اٹھے: "اے ضمام! اپنی زبان کو روکو، ایسا نہ ہو کہ تم برص، جذام یا جنون میں مبتلا ہو جاؤ"۔ اس نے جواب دیا "بخدا! وہ نہ تو ہمیں کوئی ضرر پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی نفع۔ خدا نے ایک رسول بھیج دیا ہے اور اس پر ایک کتاب نازل کی ہے، جس کے ذریعہ سے اس نے تم کو گمراہی سے نجات دلائی ہے۔ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے اور وہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور محمدؐ اس کے بندہ اور رسول ہیں، اور میں ان کے پاس سے اللہ کے احکام لایا ہوں"۔ ضمام کی اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ شام ہونے سے پہلے ہی قبیلہ کے تمام مرد اور عورت اسلام میں داخل ہو گئے۔

اس طرح کے واقعات مختلف صورتوں میں اسلام کی تاریخ میں پیش آتے رہے ہیں۔ بار بار ایسا ہوا کہ کسی شخص یا جماعت کو اسلام کی کچھ باتیں پہنچیں۔ اس سے ان کے اندر مزید جاننے کی جستجو پیدا ہوئی۔ انھوں نے ملاقات یا مطالعہ کے ذریعہ اپنی معلومات کو بڑھانا شروع کیا یہاں تک کہ ان پر حقیقت کھل گئی اور ان میں سے بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہو گئے یہ صورتِ حال موجودہ زمانہ میں مزید اضافہ کے ساتھ جاری ہے۔

تجسس انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ آدمی ہمیشہ نئی باتوں کو جاننے کی تلاش میں رہتا ہے۔ یہ جذبہ موجودہ سائنسی دور میں اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اسی بنا پر دورِ جدید کی اسپرٹ کو اسپرٹ آف انکوائری کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں لوگ بڑی تعداد میں اپنے آپ اسلام قبول کر رہے ہیں۔

اشاعت عام

فتح مکہ کے بعد اسلام سارے عرب میں پھیل گیا۔ ملک کے مختلف حصوں سے لوگ کثرت سے مرکز اسلام مدینہ آنے لگے تاکہ اس دین کے بارے میں مزید معلومات حاصل کریں اور واپس جاکر اپنے قبیلہ کے لوگوں کو بتائیں۔ خاص طور پر ۹ھ میں کثرت سے قبائل کے وفود مدینہ آئے۔ اسی لیے اس سال کو عام الوفود کہا جاتا ہے۔ ان آنے والے وفود کی تعداد تقریباً ۶۰ تک بتائی گئی ہے۔

یہ وفود جو قبائل کے نمائندے ہوتے تھے وہ مدینہ آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کی مزید معلومات حاصل کرتے۔ پھر آپ کے ہاتھ پر بیعت کرکے اسلام قبول کرلیتے۔ اس کے بعد وہ اپنے قبیلے میں جاتے اور ان کو اسلام کی باتیں بتاتے۔ اس طرح دھیرے دھیرے پورے عرب کے لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔

وفود کی آمد کا یہ سلسلہ کیسے شروع ہوا۔ وہ اتفاقاً پیش نہیں آیا۔ اس کے پیچھے برسوں کی دعوتی جدوجہد تھی۔ جس کے نتیجہ میں اسلام تمام عرب قبائل میں بحث کا موضوع بنا ہوا تھا۔ یہ سلسلہ مکی دور ہی میں شروع ہوگیا تھا جب کہ کعبہ کی زیارت کے لیے آنے والوں سے رسولؐ اور اصحاب رسولؐ ملتے اور انھیں اسلام کی باتیں بتاتے۔ اسی طرح بعد کے سالوں میں سفروں اور ملاقاتوں کی صورت میں یہ سلسلہ جاری رہا۔ قریش کی مخالفت نے بھی اسلام کی خبروں کو سارے عرب میں پھیلادیا، وغیرہ۔

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف علاقوں میں تبلیغی وفود بھیجے۔ مثلاً آپ نے حضرت ابوموسیٰ اور حضرت معاذ بن جبل کو اسلام کی تبلیغ کے لیے یمن بھیجا۔ ان دونوں کو بھیجتے ہوئے آپؐ نے انھیں یہ نصیحت کی: یسّروا ولا تعسّروا، وبشّروا ولا تنفّروا (تم لوگ آسانی پیدا کرنا، تنگی پیدا نہ کرنا اور تم لوگ خوش خبری دینا، لوگوں کو متنفر نہ کرنا) ان لوگوں کی تبلیغ کے بعد یمن کا وفد مدینہ آیا اور انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔

اسی طرح آپ نے حضرت خالد اور حضرت علی کو قبیلۂ ہمدان کی طرف اسلام کی تبلیغ

کے لیے بھیجا جو یمن کے قریب آباد تھا۔ یہ لوگ ان سے مل کر انھیں اسلام کی باتیں بتاتے۔ وہ اونٹ پر بیٹھ کر ان کی بستیوں کے درمیان چلتے اور کہتے کہ اے لوگو! لاالٰہ الااللہ کہو، تم فلاح پاؤ گے: یاایھاالناس قولو لاالٰہ الا اللہ تفلحوا۔ اس کے نتیجہ میں وہ لوگ اسلام سے متاثر ہوگئے اور اسلام قبول کرلیا۔ حضرت علیؓ نے آپؐ کو ان کے اسلام لانے کی اطلاع بھیجی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کا خط پڑھا تو سجدہ میں گر پڑے، پھر سر اٹھایا اور فرمایا: سلامتی ہو ہمدان پر، سلامتی ہو ہمدان پر۔

اس طرح کئی سال کی براہ راست اور بالواسطہ دعوتی کوششوں کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ عرب کے ہر گوشہ سے قبائل کے وفود مدینہ پہنچے ان میں سے کوئی وہ تھا جو پہلے ہی اسلام کو بخوبی طور پر سمجھ چکا تھا۔ کوئی وہ تھا جس نے آپؐ سے گفتگو کرکے اسلام کے بارہ میں مزید اطمینان حاصل کیا۔ اس طرح ایک کے بعد ایک لوگ مدینہ آتے رہے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے پورا عرب اسلام میں داخل ہوگیا۔

عرب میں اسلام کی یہ اشاعت تمام تر دعوت کے ذریعہ ہوئی نہ کہ جنگ وقتال کے ذریعہ۔ قریش کے سرداروں سے دو بار جنگ پیش آئی۔ ایک بدر میں اور دوسرے احد میں۔ اسی طرح قبیلۂ ہوازن کے سرداروں سے ایک جنگ ہوئی جس کو غزوۂ حنین کہا جاتا ہے۔ اس کے سوا عرب قبائل سے رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ کی کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ غزوۂ خندق کے موقع پر قریش کے سردار مختلف قبیلہ کے لوگوں کو بھڑکا کر مدینہ لے آئے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکیمانہ تدبیر سے جنگ کی نوبت نہ آنے دی۔

حقیقت یہ ہے کہ عرب میں اسلام کی عمومی اشاعت تمام تر پُرامن جدوجہد کے ذریعہ ہوئی۔ یہ پُرامن دعوتی جدوجہد بیس سال سے زیادہ مدت تک جاری رہی۔ اس درمیان میں طرح طرح کے واقعات پیش آئے۔ اختلاف اور اتفاق کے مختلف تجربوں کے درمیان وہ مسلسل جاری رہی۔ ان میں بعض جنگی ٹکراؤ کے واقعات بھی شامل ہیں جو بعض سرداروں کی ضد کے نتیجہ میں پیش آئے۔ مثلاً بدر کی لڑائی ابوجہل کی ضد کا نتیجہ تھی۔ اسی طرح احد اور حنین کی لڑائی بھی بعض سرداروں کی انانیت کی وجہ سے پیش آئی۔ ان جنگوں کا تعلق حقیقۃً کچھ سرداروں سے تھا نہ کہ عرب عوام سے۔

اسلام کی کشش

عراق کے صدر صدام حسین نے اگست ۱۹۹۰ میں اپنی فوجیں کویت میں داخل کر دیں، اور اعلان کر دیا کہ کویت کوئی علاحدہ ملک نہیں، بلکہ وہ عراق کا ایک صوبہ ہے۔ اس کے بعد عالمی سطح پر سیاسی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ اقوام متحدہ کے رزولیوشن کے تحت امریکہ نے اپنی فوجیں سعودی عرب میں اور عراق کے قریبی علاقوں میں پہنچا دیں۔ پانچ ماہ تک سرگرم بات چیت کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر جب صدام حسین اپنی فوجیں واپس بلانے پر راضی نہیں ہوئے تو امریکہ نے جنوری ۱۹۹۱ میں عراق پر بھرپور حملہ کر دیا۔ یہاں تک کہ عراقی فوجیں کویت چھوڑنے پر مجبور ہو گئیں۔

یہ جنگ بلاشبہ ایک ناخوش گوار بات تھی، مگر اس کے اندر سے ایک خوش گوار پہلو نکل آیا۔ اس بحران کے نتیجے میں تقریباً ایک سال تک امریکہ کے فوجی اور غیر فوجی لوگ بڑی تعداد میں عرب ملکوں میں آتے جاتے رہے اور لمبی مدت تک یہاں قیام کیا۔ اس کے نتیجے میں بہت بڑے پیمانہ پر امریکیوں کا اختلاط مسلمانوں سے ہوا۔

یہ اختلاط فطری طور پر تعارفِ اسلام کا ذریعہ بن گیا۔ اس سلسلے میں بہت سے واقعات پیش آئے۔ مثلاً یہ امریکی مختلف اسباب سے مسلم اداروں میں اور مسلم آبادیوں میں جاتے اور مسلمانوں سے ان کی بات چیت ہوتی۔ امریکہ کی فوجی ٹی وی تنظیم نے اسلامی عقائد اور اسلامی کلچر پر تفصیلی ویڈیو فلمیں بنائیں، یہ فلمیں ان تمام امریکیوں کو دکھائی گئیں جو عرب ملکوں میں مقیم تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ امریکی مسلمانوں کے مذہب اور کلچر سے واقف ہو جائیں جن کے درمیان انھیں اپنا کام کرنا ہے۔

اس دوران ایک اور زیادہ بڑا واقعہ ہوا۔ عرب علاقوں میں مقیم امریکی فوجیوں نے اپنے اعلیٰ افسران سے یہ فرمائش کی کہ ان کے لیے اسلامی لکچروں کا انتظام کیا جائے۔ امریکی فوج کے ذمہ داروں نے اس کے لیے سعودی عرب کے ایک پروفیسر دکتور زغلول النجار کا انتخاب کیا۔ وہ ایک مصری عالم تھے اور اسی کے ساتھ وہ انگریزی زبان بھی بخوبی جانتے تھے۔

انھوں نے امریکی فوجوں کے کیمپوں میں جاکر انگریزی میں لکچر دیے جن میں تفصیل کے ساتھ اسلامی عقائد اسلامی طرز زندگی اور اسلامی تاریخ کا تعارف کرایا گیا۔ ان کوششوں کے نتیجے میں ہزاروں امریکی اسلام سے گہرے طور پر متاثر ہوئے۔ قاہرہ کے ایک عربی جریدہ "آخر ساعة مصر" (۲۱ رجب ۱۴۱۱ھ) نے بتایا ہے کہ صرف ڈاکٹر نجار کے ذریعے جو امریکی اسلام میں داخل ہوئے ان کی تعداد تقریباً دو ہزار ہے۔

خلیجی بحران کے زمانے میں پیش آنے والا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اسلام کی دعوت کس طرح ہر حال میں اپنی تسخیری حیثیت کو برقرار رکھتی ہے۔ سیاسی اور جنگی حالات کا اتار چڑھاؤ اس کی ابدیت میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتا۔

خلیجی بحران کے زمانے میں لوگوں کو مختلف قسم کے نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ حتی کہ انھیں ذلت کے تجربات بھی ہوئے۔ ساری دنیا میں مسلمانوں کی تصویر یہ بن گئی کہ وہ اپنے خلاف جارحیت کو روکنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس قسم کے تمام منفی پہلوؤں کے باوجود عین اس وقت یہ سبق آموز واقعہ پیش آیا کہ جنگی اختلاط عملاً تعارفِ اسلام کا ذریعہ بن گیا۔

مقناطیس میں یہ طاقت ہے کہ وہ لوہے کے ٹکڑوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مقناطیس کو آپ لوہے کے اوپر سے اس کے قریب لائیں یا نیچے سے، اس کو دائیں سے قریب کریں یا بائیں سے، ہر حال میں ایسا ہوگا کہ — مقناطیس لوہے کے ٹکڑوں کو اپنی طرف کھینچ لے گا۔ یہی معاملہ اسلام کا ہے۔

اسلام ہر حال میں انسان کے لیے باعثِ کشش ہے، خواہ اسلام کے ساتھ اس کا سابقہ کسی بھی صورت یا کسی بھی حال میں پیش آئے۔

اسلام کی دعوتی تاریخ بتاتی ہے کہ اس کی یہ صفت ہر دور میں ظاہر ہوتی رہی ہے۔ ابتدائے اسلام سے اب تک مسلمانوں پر مختلف قسم کے اتار چڑھاؤ پیش آئے ہیں۔ مگر ہر دور اور ہر حال میں اسلام نے حالات سے غیر متاثر رہ کر اپنا نفوذ جاری رکھا۔ وہ دوست اور دشمن دونوں کے دلوں میں اپنی جگہ بناتا رہا۔

تسخیری قوت

مکہ کے اخبار العالم الاسلامی (۲۹ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ ۲۷ نومبر ۱۹۸۹ء) میں ایک سبق آموز واقعہ چھپا ہے۔ جس کا عنوان یہ ہے:

فشلُ المخطط الكنسي لأفرقة التنصير

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ عیسائی تنظیموں نے اعلیٰ تربیت کے ذریعے ۶۴۵۲ مبلغین تیار کیے اور ان کو افریقی ملک لیبیریا کی راجدھانی منروویا (Monrovia) بھیج دیا۔ ان کا مشن یہ تھا کہ وہ خاموش تبلیغ کے ذریعے لیبیریا (Liberya) کے دس لاکھ مسلمانوں کو مسیحی مذہب میں داخل کر دیں۔

یہ مسیحی مبلغین تمام علمی اور مادی ذرائع سے پوری طرح مسلح تھے۔ ان کو اتنا زیادہ تیار کیا گیا تھا کہ وہ لیبیری قبائل کی مقامی زبانیں، بانیکا، مانکا، منیسکا، کیسکا، بلیسکا نہایت روانی کے ساتھ بولتے تھے۔

ان تمام تیاریوں کے باوجود نتیجہ الٹا ہوا۔ ان مسیحی مبلغین کی اکثر تعداد نے وہاں پہنچ کر اسلام قبول کر لیا۔ جس ملک میں وہ مسیحیت کی تبلیغ کے لیے بھیجے گئے تھے وہاں اب وہ اسلام کی تبلیغ کرنے میں مشغول ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ تربیت کے دوران انھیں مختلف مذہبوں کا مطالعہ کروایا گیا۔ مگر اس نظام کے تحت انھیں اسلام کی صرف مسخ شدہ تعلیمات ہی سے واقف کرایا گیا۔ لیبیریا میں جب ان کا سابقہ مسلمانوں سے ہوا تو انھیں موقع ملا کہ وہ اسلام کو زیادہ صحیح صورت میں جان سکیں۔ اس واقفیت کے بعد ان کی آنکھ کھل گئی۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ عیسائی تنظیموں نے اس مقصد کے لیے افریقی نسل کے مسیحیوں کا انتخاب کیا تھا تاکہ وہ لیبیریا پہنچیں تو وہاں کے لوگوں کو اجنبی دکھائی نہ دیں۔ ان کو بتایا گیا کہ وہ ملک کی قبائلی زبانوں میں مہارت حاصل کریں۔ اور وہاں کے سماج میں گھل مل کر خاموشی کے ساتھ اپنا کام کریں۔ چنانچہ یہ لوگ مسلم آبادیوں کے درمیان غیر محسوس طور پر آباد ہو گئے۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے لیبیریا کی نیشنلٹی کا سرٹیفکٹ بھی حاصل کر لیا۔ اسی

خاص انداز کار کی وجہ سے اس منصوبہ کا نام "افرقۃ التنصیر" رکھا گیا تھا۔

لیبیریا کی مسلم تنظیموں کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو انھوں نے شور و غل کا طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ جوابی تبلیغی عمل شروع کر دیا۔ مثلاً انھوں نے ملک کے مختلف شہروں فونجاما، کاکاتا، سنکولی، کاتیلا وغیرہ میں اجتماعات شروع کیے۔ اور آل مذاہب کانفرنسیں منعقد کیں۔ ان میں لوگوں کو موقع دیا گیا کہ وہ ہر مذہب کے بارے میں کھُل کر بحث و مذاکرہ کریں۔ ان کانفرنسوں میں مسیحی علماء کو سخت ناکامی ہوئی۔ مسلم علماء کے مقابلے میں وہ نہ علمی سطح پر اپنا دفاع کر سکے اور نہ دلائل کے ذریعے اپنے مذہب کی برتری ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے۔

دوسری طرف ان کانفرنسوں کے ذریعہ یہ ہوا کہ اسلام کی سچائی اور برتری نمایاں ہو کر سامنے آگئی۔ اس سے ان مسیحی مبلغین میں مایوسی اور ذہنی انتشار پیدا ہوا۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے اپنے موجودہ مشغلہ کو اپنی فطرت کی آواز کے خلاف سمجھا۔ وہ عیسائیت کے بجائے اسلام کی مزید تحقیق میں لگ گئے یہاں تک کہ ان کی اکثریت نے قبولِ اسلام کا اعلان کر دیا۔ جو لوگ مسیحی مبلغ بن کر آئے تھے وہ اسلام کے مبلغ اور اس کے علم بردار بن گئے۔

اس طرح کے واقعات اسلام کی تاریخ میں بار بار پیش آئے ہیں۔ بار بار ایسا ہوا ہے کہ کسی فرد یا گروہ کو اسلام کے بارے میں غلط معلومات دی گئیں، جس کی وجہ سے وہ لوگ اسلام سے بدظن ہو گئے۔ لیکن جب ان کا سابقہ براہِ راست طور پر اسلام اور اہلِ اسلام کے ساتھ پیش آیا تو ان کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور وہ اسلام کی صداقت کا اعتراف کر کے اس کے دائرے میں داخل ہو گئے۔

اسلام کے لیے خارجی سازش یا عداوت کوئی خطرہ نہیں۔ بلکہ اصل خطرہ یہ ہے کہ اسلام کی صحیح تعلیمات لوگوں کے سامنے پیش نہ کی جا رہی ہوں۔ اہلِ اسلام کے لیے کرنے کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ اسلام کے خلاف سازشوں کی دریافت میں مشغول ہوں۔ ان کے کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ اسلام کی اصلی اور واقعی تعلیمات کو لوگوں کی قابلِ فہم زبان میں ہر جگہ پہنچا دیں، اس کے بعد اسلام اپنے آپ لوگوں کو مسخر کرنے کے لیے کافی ہو جائے گا۔

کلامِ الٰہی کی تاثیر

قرآن میں ایسے کئی لوگوں کا ذکر آیا ہے جنھوں نے خدا کے کلام کو سنا۔ اس کو سن کر ان پر حقیقت کھل گئی۔ اس کے بعد انھوں نے دین اسلام اختیار کر لیا۔ ان ہی میں سے ایک قصہ وہ ہے جو قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں آیا ہے۔ ان آیات کا ترجمہ یہ ہے:

اور جب انھوں نے اس کلام کو سنا جو رسولؐ پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھوگے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اس سبب سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے، پس تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ اور ہم کیوں نہ ایمان لائیں اللہ پر اور اس حق پر جو ہمیں پہنچا ہے جب کہ ہم یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو صالح لوگوں کے ساتھ شامل کرے۔ پس اللہ ان کو اس قول کے بدلے میں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہی بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کا۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عیسائیوں کا ایک وفد تھا جو مدینہ آیا۔ وہ لوگ غالباً عربی زبان سمجھتے تھے۔ رسول اللہؐ نے ان کو قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔ یہ لوگ قرآن کے الفاظ سن کر گہرے طور پر متاثر ہوئے یہاں تک کہ ان کا تاثر آنسوؤں کی صورت میں ان کی آنکھوں سے بہہ پڑا۔ ان آیات پر غور کرنے سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

قرآن خدا کی مستند کتاب ہے۔ اس میں خالق نے اپنی تخلیق کے بارے میں حقیقتِ واقعہ کا اظہار کیا ہے۔ قرآن زندگی اور کائنات کی حقیقت کو بتاتا ہے۔ وہ ان سوالات کا صحیح ترین اور کامل ترین جواب ہے جن کا واضح جواب انسان پانا چاہتا ہے۔

مذکورہ لوگوں نے جب قرآن کو سنا تو انھوں نے محسوس کیا کہ قرآن عام طرز کی کوئی انسانی کتاب نہیں ہے بلکہ وہ خداوند عالم کی کتاب اور اس کا کلام ہے اور اس بنا پر اس کے اندر حقائقِ فطرت کی کامل رعایت موجود ہے۔ قرآن اپنی صفت کی بنا پر براہِ راست ان کے سینے میں داخل ہو گیا اور ان کی سوئی ہوئی روحانیت کو جگا دیا۔

قرآن کے کلام کو سننا ان کے لیے معرفتِ حق کا ذریعہ بن گیا۔ یہی حق کی معرفت تھی جس نے ان کی آنکھوں کو اشکبار کر دیا۔ آنسو انسان کی تخلیق کا ایک پُر اسرار کرشمہ ہے۔ آنسو قلب اور روح کی زبان ہے۔ انسان جب، مادی سطح سے اوپر اٹھ کر اس ربانی سطح پر پہنچتا ہے جہاں بندہ براہِ راست طور پر اپنے خدا سے متعارف ہوتا ہے، اس وقت انسانی شخصیت کے تمام بند دروازے کھل جاتے ہیں۔ اس وقت اس کی شخصیت پھٹ کر آنسوؤں کی صورت میں بہہ نکلتی ہے۔ یہی ان لوگوں کے ساتھ پیش آیا۔

یہ لوگ جب ایمان لائے تو انھوں نے کہا کہ اے ہمارے رب! ہم کو گواہی دینے والوں میں سے لکھ لے۔ کائنات میں خدا کی تجلیاں اَن گنت روپ میں رکھ دی گئی ہیں۔ خدا اپنی صفات کے ساتھ ہر طرف اپنا جلوہ دکھا رہا ہے۔ لیکن ظہور کا یہ پورا عمل خاموش زبان میں ہے۔ انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس تجلیاتی ظہور کا ادراک کرتا ہے اور پھر نطق کی زبان میں اس کی تصدیق و شہادت پیش کرتا ہے۔ کسی انسان کی سب سے بڑی سعادت یہ ہے کہ خدا کے یہاں وہ ان لوگوں کی فہرست میں شامل ہو جائے جنھوں نے نطق کی زبان میں خدا کا اور اس کی صفاتِ کمال کا اقرار کیا —— جنت اس اقرار و اعتراف کی قیمت ہے۔

دعوتِ اسلام کی یہ امتیازی صفت ہے کہ اس کے پاس خدا کا کلام بے آمیز حالت میں موجود ہے۔ یہ گویا حقیقتِ حال کا صحیح ترین بیان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں قرآن بیشتر لوگوں کے لیے قبولِ اسلام کا سبب بنا۔ قرآن گویا انسان کی عین وہی مطلوب کتاب ہے جس کو وہ پیشگی طور پر تلاش کر رہا ہے۔ چنانچہ کوئی آدمی جب کھلے ذہن کے ساتھ قرآن کو پڑھتا ہے تو وہ اس کے لیے اس کی فطرت کی تصدیق بن جاتا ہے۔ وہ اس کو اپنی مطلوب چیز سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔

انسان فطری طور پر چاہتا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی صحبت میں رہے جو اہلِ حق ہیں۔ جو حقیقی انسانی اوصاف رکھنے والے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ چلنے کا ہی نام زندگی ہے۔ کوئی آدمی جب قرآن کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ یہی وہ کتاب ہے جو اس کو مطلوب منزل تک پہنچانے والی ہے۔ وہ عین اپنی اندرونی آواز کے تحت مجبور ہوتا ہے کہ اس کو اختیار کر لے۔

اپنی طرف واپسی

کراچی سے ایک انگریزی ہفت روزہ یقین انٹرنیشنل کے نام سے نکلتا ہے۔اس کے شمارہ ۲۲ اگست ۱۹۹۱ کے ایک مضمون کا عنوان ہے : میں نے کیوں اسلام قبول کیا (Why did I embrace Islam)

یہ ایک نومسلم مسٹر چیمپین (Darly champion) کی کہانی ہے۔ وہ ساؤتھ آسٹریلیا کے شہر ایڈیلیڈ (Adelaide) میں ایک مسیحی خاندان میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ان کے اندر تلاش حق کا جذبہ تھا۔ بارہ سال کی عمر میں اسکول پارٹی کے ساتھ ایک بار وہ ایک مقامی مسجد میں گئے۔ یہ مسجد سو سال پہلے ان افغانیوں نے بنائی تھی جو ساربان (camel driver) کے طور پر یہاں لائے گئے تھے اس مسجد کی سادگی کو دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوئے۔ اور ان کے اندر یہ شوق پیدا ہوا کہ وہ مسلمانوں کے مذہب کا مطالعہ کریں۔

بعد کو وہ میڈیا انڈسٹری میں داخل ہو گئے۔ اس سلسلے میں انھیں سڈنی آنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں ان کی ملاقات کچھ مسلمانوں سے ہوئی، ان سے انھوں نے قرآن کا انگریزی ترجمہ لے کر پڑھا، مزید مطالعہ کے بعد وہ یکم جون ۱۹۸۴ کو سڈنی کی ایک مسجد میں گئے اور کلمۂ شہادت ادا کر کے اسلام قبول کر لیا۔

موصوف نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنا نام قمر القلب رکھا۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے اسلام کیوں قبول کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اسلام قبول نہیں کیا بلکہ میں نے اسلام کو از سر نو دریافت کیا۔ میرے بارے میں آپ نے جو کچھ سنا ہے وہ تبدیلیٔ مذہب کا قصہ نہیں ہے بلکہ وہ اس مذہب کو دوبارہ دریافت کرنے کا قصہ ہے جو میری فطرت میں پہلے سے موجود تھا (اصل انگریزی کے لیے ملاحظہ ہو، عظمتِ اسلام، صفحہ ۱۸۸)

اسلام دین فطرت ہے۔ وہ ہر آدمی کا اپنا مذہب ہے۔ اسلام کو قابل قبول بنانے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ لوگوں سے معتدل تعلقات قائم کیے جائیں اور اسلام کے مثبت پیغام سے انھیں باخبر کر دیا جائے اس کے بعد وہ اپنے آپ

کھنچ کر اسلام کی طرف آجائیں گے۔

ایک شخص پر جب اسلام کی سچائی منکشف ہوتی ہے اور اسلام کو وہ اپنا دین بناتا ہے تو یہ اس کے لیے کسی اجنبی چیز کو ماننا نہیں ہوتا بلکہ یہ اس کے لیے خود اپنی طرف واپسی کے ہم معنیٰ ہوتا ہے۔ اس کے لیے یہ ایک ایسا تجربہ ہوتا ہے گویا کہ وہ اپنے آپ سے بے خبر ہو گیا تھا، اور اب اس نے دوبارہ اپنے آپ کو دریافت کر لیا ہے۔

اسلام آدمی کے فطری تقاضے کا جواب ہے۔ اسلام میں زندگی کا متوازن قانون ہے۔ اسلام میں وہ صحیح ترین رہنمائی ہے جس کو اختیار کرکے انسانیت کا قافلہ اپنی منزل کی طرف کامیاب سفر کر سکے۔ اسلام کی تعلیمات ان تضادات سے پاک ہیں جو دوسرے نظاموں میں پائی جاتی ہیں۔ اسلام وہ شاہراہ فراہم کرتا ہے جس میں دنیا کی بھی فلاح ہے اور آخرت کی بھی فلاح۔

اسلام پیشگی طور پر لوگوں کا مطلوب ہے۔ اسلام کا داعی جب اسلام کی دعوت لے کر اٹھتا ہے تو یہ ایک ایسی چیز کو لے کر اٹھنے کے ہم معنی ہوتا ہے جو کسی بھی درجے میں لوگوں کے لیے اجنبی نہیں۔ باعتبار حقیقت، لوگوں کے لیے وہ اتنا ہی محبوب ہے جتنا کہ لوگوں کے لیے خود اپنا وجود۔

اسلام کی دعوتی کامیابی کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں اسلام کے خلاف بدگمانیاں نہ ہوں۔ لوگ اسلام یا اہل اسلام سے بدکے ہوئے نہ ہوں۔ اگر کسی وجہ سے ایسا ہو جائے تو داعی کو پہلا کام یہ کرنا ہوگا کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جو غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا خاتمہ کرنے والے ہوں۔ ایسے حالات پیدا ہوتے ہی لوگ اپنے آپ اسلام کی طرف دوڑ پڑیں گے۔

اسلام دینِ فطرت ہے۔ اسلام کی طرف آنا خود اپنی طرف آنا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے پیاسا پانی کی طرف دوڑے۔ اسلام آدمی کی اپنی ذات کی تکمیل ہے۔ اسلام آدمی کے روحانی خلا کو پُر کرتا ہے۔ ایسا دین ہر آدمی کی اپنی ضرورت ہے، اور کون ہے جو خود اپنی ضرورت کی تکمیل سے انکار کرے، جو اپنی فطرت کے تقاضے کو نہ مانے۔

دل کی آواز

مسٹر سبورو ایک جاپانی پروفیسر تھے۔ ایک ادارہ نے ان سے کہا کہ وہ جاپانی انسائیکلوپیڈیا کے لیے اسلام پر ایک آرٹیکل تیار کریں۔ اس مقصد کے تحت انھوں نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا۔ مطالعہ کے دوران ان پر اسلام کی سچائی روشن ہوتی چلی گئی۔ ان کے دل نے گواہی دی کہ یہی انسانیت کا حقیقی مذہب ہے۔ یہاں تک کہ جب ان کا آرٹیکل تیار ہوا تو وہ خود بھی اسلام قبول کر کے عملاً اسلام کے دائرہ میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ واقعہ ۱۹۳۰ کا ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، عظمتِ اسلام، صفحہ ۱۶۲)

یہ کوئی انفرادی واقعہ نہیں، اس طرح کے واقعات دورِ اول سے لے کر اب تک مسلسل پیش آتے رہے ہیں۔ بار بار ایسا ہوا ہے کہ ایک غیر مسلم محض واقفیت حاصل کرنے کے لیے اسلام کا مطالعہ شروع کرتا ہے مگر جب وہ اپنے مطالعہ کی تکمیل تک پہنچتا ہے تو وہ کلمۂ توحید کا اقرار کر کے اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اسلام کسی بھی شخص کے لیے کوئی اجنبی مذہب نہیں۔ وہ ہر آدمی کا اپنا مذہب ہے۔ اسلام ایک فطری دین ہے اس اعتبار سے وہ گویا فطرتِ انسانی کا مثنیٰ ہے۔ کوئی آدمی جب کھلے ذہن کے تحت اسلام کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اسلام اس کے اپنے دل کی آواز ہے۔ اسلام کی صورت میں آدمی خود اپنے آپ کو دریافت کرتا ہے۔ اور پھر اسلام کو اپنا دین بنانے میں اسے کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔

اسلام کی یہی وہ صفت ہے جس نے اس کے اندر غیر معمولی تسخیری طاقت پیدا کر دی ہے۔ امکانی طور پر، اسلام ہر آدمی کے دل کی آواز ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اس کو اس کی بے آمیز صورت میں انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

اسلام کی نفی خود اپنی ذات کی نفی ہے۔ کوئی آدمی اپنا انکار نہیں کر سکتا، اس لیے کوئی آدمی اسلام کا بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی شخص اسلام کا انکار کرتا ہوا دکھائی دے تو

یقینی طور پر اس کی وجہ کوئی غیر فطری رکاوٹ ہوگی۔ اس غیر فطری رکاوٹ کو ہٹا دیجئے، اور پھر اسلام اور انسان کے درمیان کوئی دوری باقی نہیں رہے گی۔

جس خدا نے انسان کو بنایا ہے، وہی اسلام کو وضع کرنے والا بھی ہے۔ اس نے انسان کی فطرت اور اسلام کی تعلیمات دونوں کو اس حد تک ایک دوسرے کے مطابق بنایا ہے کہ حقیقی اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

جس خدا نے انسان کی تخلیق کی ہے اسی نے ہوا کا غلاف بھی زمین کے اوپر لپیٹا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے نظامِ تنفس اور ہوا کے آکسیجن میں کامل مطابقت پائی جاتی ہے۔ جس خدا نے انسان کے اندر نظامِ ہضم کو بنایا ہے اسی نے وہ غذائی اشیاء بھی بنائی ہیں جو زمین میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظامِ ہضم اور غذائی اشیاء میں اس درجہ مطابقت ہے کہ دونوں فوراً ایک دوسرے کو قبول کر لیتے ہیں۔

یہی معاملہ اسلام اور انسان کا ہے۔ جو ہستی انسان کی خالق ہے۔ وہی اسلام کو وضع کرنے والی بھی ہے۔ اس نے جس نہج پر انسانی فطرت کو بنایا ہے اسی نہج پر اس نے دینِ اسلام کو بھی وضع کیا ہے۔ اسی لیے دعوت کا عمل صرف یہ ہے کہ اسلام کو انسان کے قریب تک پہنچا دیا جائے۔ اس کے بعد انسان کی فطرت خود حرکت میں آجائے گی اور اپنے مطلوب کو اس طرح لے لے گی جیسے کہ وہ پہلے ہی سے اس کی منتظر تھی۔

پروفیسر آرنلڈ نے اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں اور اسی طرح دوسرے مؤرخین نے اس بات کو حیرت کے ساتھ نوٹ کیا ہے کہ اسلام کسی خاص تبلیغی کوشش کے بغیر اپنے آپ پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ وہ ماضی میں بھی زیادہ تر اپنے آپ پھیلا اور آج بھی زیادہ تر اپنے آپ ہی پھیل رہا ہے، مگر اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے فطرت کے زور پر ہو رہا ہے اور فطرت کے زور پر ہمیشہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

تمام انسان ہر روز پانی پیتے ہیں۔ ایسا فطرت کے زور پر ہوتا ہے۔ اسلام کا معاملہ بھی فطرت کا معاملہ ہے۔ اسلامی دعوت کے سلسلہ میں اصل اہمیت داعی اور مدعو کے درمیان رکاوٹ کو دور کرنا ہے۔ رکاوٹ کے دور ہوتے ہی اسلام اپنا عمل اپنے آپ شروع کر دے گا۔

میدانِ جنگ کے باہر

بیکی ہاپکنس (Becky Hopkins) ایک امریکی خاتون ہیں، وہ عیسائی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ اس کے بعد انھیں قرآن کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس مطالعہ سے وہ اتنا متاثر ہوئیں کہ انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ ان کا ایک تفصیلی خط ایک امریکی میگزین اسلامک ھورائزن (دسمبر ۱۹۸۷) میں چھپا ہے۔ اس کا کچھ حصہ ہم یہاں نقل کررہے ہیں۔ وہ لکھتی ہیں:

جن سوالوں کا جواب میں اپنی پوری زندگی میں تلاش کرتی رہی ہوں، ان کا جواب پانا میرے لیے کتنا زیادہ تسکین کا باعث ہے اس کو لفظوں میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی اندھا ہو اور پھر اچانک وہ سچائی کو دیکھنے لگے اور ایسی روشنی کو پالے جس کو اس نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ میں اس خوشی کو کیوں کر بیان کرسکتی ہوں جو صرف سچائی کو پانے سے حاصل ہوتی ہے۔

میں چاہتی ہوں کہ میں نے جو چیز پائی ہے اس کو میں ساری دنیا کے سامنے گاؤں۔ میں چاہتی ہوں کہ ہر شخص جس کو میں نے کبھی جانا ہو وہ اس میں میرا حصہ دار بنے اور جو دروازہ میرے لیے کھلا ہے اس پر جشن منانے میں وہ میرا شریک ہو۔

اور سب سے زیادہ بڑی اور سب سے زیادہ عجیب چیز جو مجھے دکھائی گئی وہ قرآن تھا۔ کتنا زیادہ میں اپنے قرآن سے محبت کرتی ہوں۔ جب بھی مجھے موقع ملتا ہے تو میں اس کو پڑھتی ہوں۔ میں اس کو اپنے سے الگ نہیں رکھ سکتی۔ حتی کہ انگریزی ترجمہ میں بھی اس کے الفاظ میرے دل کو مسرت دیتے ہیں اور میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

کتنی ہی بار ایسا لمحہ آیا ہے جب کہ میں نے خدا کی کتاب کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے اور اس کے بارہ میں سوچ کر میں روئی ہوں۔ اس کے بغیر میری ساری زندگی کتنی احمقانہ زندگی ہوتی۔ اسلام کے بغیر میری زندگی کیسی ہوتی، اس کو سوچ کر میں کانپ اٹھتی ہوں۔

اگر میں سب سے زیادہ اونچے پہاڑ پر چڑھ سکتی اور میری آواز ہر اس آدمی تک پہنچ سکتی جو اسلام سے بے خبر ہے تو میں چلا کر ان کو وہ بتاتی جو مجھ کو معلوم ہوا ہے۔ میرے سوالات

کا جواب مجھے مل گیا۔ اب میں جانتی ہوں کہ سچائی کیا ہے۔ ہر آدمی جو دنیا میں ہے، وہ مجھ کو سچائی ملنے پر اگر اللہ کا شکرادا کرے، اور وہ ایک سو سال تک ہر روز ایک سو بار ایسا ہی کرتا رہے تب بھی اس احسان پر شکر کا حق ادا نہیں ہوگا (اصل انگریزی الفاظ کے لیے ملاحظہ ہو، عظمتِ اسلام، صفحہ ۸۲)

سچائی اپنی ذات میں تبلیغ ہے۔ جب کسی آدمی کو سچائی ملتی ہے تو یہ اس کے لیے عظیم ترین دریافت کے ہم معنی ہوتی ہے۔ اس کے بعد چپ رہنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ وہ بے تاب ہو کر یہ چاہنے لگتا ہے کہ جس نور کو اس نے پایا ہے اس سے دوسروں کی راہوں کو بھی روشن کرے، جو سعادت اس کے حصہ میں آئی ہے اس میں دوسروں کو بھی حصہ دار بنا دے۔

اسلام ایسی ہی سچائی ہے۔ اور اس کی یہی صفت ہر دور میں اس کی اشاعت و تبلیغ کی ضامن رہی ہے۔ ہر دور میں ایسا ہوا کہ جن لوگوں کے اوپر اسلام کی صداقت منکشف ہوئی وہ عین اسی کے ساتھ اس کے مبلغ بن گئے۔ خود اسلام کو پانے کے بعد وہ بے قرار ہو گئے کہ اسے دوسرے انسانوں تک پہنچائیں۔

دور اول میں صحابہ و تابعین اپنے وطن سے نکل کر دور دور کے ملکوں میں چلے گئے۔ جہاں کی زبان اور کلچر ان کے لیے اجنبی تھا، وہاں ان کے لیے معاش کا بھی کوئی ذریعہ موجود نہ تھا۔ وہاں پہلے سے ان کا کوئی جاننے والا نہ تھا جو ان کا استقبال کرے۔ اس اجنبیت کے باوجود وہ دور دراز کے ملکوں میں داخل ہو گئے۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ جہاں کہیں بھی انسان بستے ہیں وہاں انھیں جانا ہے۔ جہاں کہیں بھی کان اور آنکھ والے لوگ موجود ہیں وہاں انھیں پہنچنا ہے تاکہ وہ سننے والوں کو سنائیں اور دیکھنے والوں کو سچائی کا راستہ دکھائیں۔

مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان جو لڑائیاں پیش آئیں ان کا اشاعتِ اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ ان لڑائیوں کا تعلق تمام تر حکمرانوں سے تھا۔ یہ لڑائیاں میدانِ جنگ میں شروع ہوئیں اور میدان جنگ ہی میں ختم ہو گئیں۔ دعوت کا کام تمام تر عام انسانوں کے درمیان انجام پاتا ہے اور وہ ہر دور میں عام انسانوں کے درمیان ہی پُر امن طور پر انجام پایا ہے۔

شکست کے باوجود

اسلام کی طاقت کا اصل سرچشمہ اس کی فکری اور نظریاتی صداقت ہے۔ اسلام کی اس حیثیت نے اہل اسلام کو ایک ایسی طاقت کی حیثیت دے دی ہے جو کہیں بھی اور کسی بھی حال میں مغلوب نہ ہو۔ اس حقیقت کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ الاسلام یعلو ولا یُعلیٰ (اسلام ہمیشہ غالب رہتا ہے، وہ کبھی مغلوب نہیں ہوتا) اس معاملہ کی ایک مثال اسپین کے مسلمان ہیں۔ وہ اس حد تک مغلوب ہوئے کہ انھیں اسپین سے جلاوطن ہونا پڑا۔ اس کے باوجود دعوتی طاقت بدستور ان کے ساتھ موجود رہی۔ چنانچہ یہی جلاوطن مسلمان ہیں جنھوں نے شمالی افریقہ میں دعوتی عمل کر کے اس علاقہ کو مستقل طور پر ایک اسلامی علاقہ بنا دیا۔

پروفیسر آرنلڈ نے اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں دکھایا ہے کہ الجزائر کے بربری قبائل میں اسلام کس طرح پھیلا۔ ان قبائل میں کچھ لوگ عیسائی تھے اور زیادہ تر وہ لوگ تھے جو قدیم مشرکانہ مذہب پر قائم تھے۔ یہ لوگ پہاڑی علاقہ میں رہتے تھے اور پہاڑوں کے حصاروں میں بند تھے۔ قبائلی مزاج کے تحت وہ اپنی خود مختاری کے دلدادہ تھے اور بیرونی سیاسی اثرات کو اپنے اندر داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ لہٰذا ان کو اسلام کی تعلیمات پہنچانا ایک بے حد مشکل کام تھا۔ اس سے پہلے قادریہ سلسلہ کی ایک خانقاہ (ساقیۃ الحمراء) کے صوفیوں نے ان کے یہاں ایک تبلیغی مشن قائم کرنے کی کوشش کی تھی مگر انھیں اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس مشکل کام کو ان لوگوں نے انجام دیا جو حکومتِ غرناطہ کے خاتمہ (۱۴۹۲) کے بعد اسپین سے جلاوطن ہو کر شمالی افریقہ پہنچے تھے اور اس خانقاہ کے علاقہ میں مقیم ہو گئے تھے۔ اس طرح کے مہاجرین میں عام طور پر عمل کا جوش دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے مقابلہ میں اپنے مقصد کے لیے زیادہ محنت کر سکتے ہیں۔ خانقاہ کے شیخ نے اس بات کو محسوس کیا۔ اس کام پر روانہ کرتے ہوئے انھوں نے ان مبلغین کو یہ پیغام دیا:

ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اسلام کا پیغام ان ملکوں میں لے جائیں جو ابھی تک اس پیغام

سے ناآشنا ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس کام میں تمہارے لیے بہت سی دشواریاں پیش آئیں گی۔ لیکن یہ خدا کا ایک مطلوب کام ہے کہ خدا کے بندوں کو خدا کے دین سے واقف کرایا جائے اس لیے یقین ہے کہ اس نیک کام میں تم کو خدا کی مدد حاصل ہوگی۔ میرے بچو! جاؤ، اور اس بھٹکی ہوئی قوم کو خدا کا راستہ دکھاؤ۔ ان کو نجات کا پیغام پہنچاؤ۔ اِن شاء اللہ خدا تمہارے شامل حال رہے گا اور تمہاری مدد فرمائے گا۔

یہ مبلغ پانچ پانچ، چھ چھ کی جماعتوں میں مختلف اطراف میں روانہ ہوگئے۔ وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے اور ہاتھ میں عصا لیے چل دیے۔ اور انھوں نے پہاڑوں کے سنسان اور غیر آباد مقامات کا انتخاب کرکے وہاں کے غاروں میں چٹانوں کے درمیان خانقاہیں قائم کیں۔ قبائل کے درمیان ان کی پرہیزگاری اور عبادت گزاری کا چرچا ہونے لگا۔ چنانچہ یہ قبیلے جلد ہی ان کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنے لگے۔ ان مبلغوں نے آہستہ آہستہ اپنے علم طب اور صنعت و حرفت اور تمدن کے دوسرے فوائد کی بدولت بربری قبائل کے درمیان کافی اثر و رسوخ قائم کرلیا۔ حتی کہ ہر خانقاہ اسلامی تعلیم و دعوت کا مرکز بن گئی۔ یہ اسپینی مسلمان چونکہ تعلیم یافتہ تھے بہت سے لوگ علم کی طلب میں بھی ان کے گرد اکٹھا ہوگئے۔ کچھ عرصہ بعد یہی نومسلم اپنے ابنائے وطن میں اسلام کی تبلیغ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کا مذہب بربری قبائل کے تمام علاقوں اور الجزائر کی تمام بستیوں میں پھیل گیا (صفحہ ۲۹ - ۱۲۸) اور یہ علاقہ مستقل طور پر ایک اسلامی علاقہ بن گیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت ایک ایسی فاتحانہ دعوت ہے جو اپنی نظریاتی برتری کو ہر حال میں باقی رکھتی ہے۔ سماجی اور اقتصادی زوال یا سیاسی مغلوبیت اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اسلام اپنی اس دعوتی قوت کی بنا پر وہاں سے بھی دوبارہ اپنے لیے زندگی حاصل کرلیتا ہے جہاں بظاہر لوگوں نے گویا اس کا خاتمہ کر دیا تھا۔

یہ تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام کا معاملہ لازمی طور پر مسلمانوں کے ساتھ بندھا ہوا نہیں ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ بظاہر جہاں ختم ہوجائے وہاں سے اسلام دوبارہ اپنے لیے نیا آغاز تلاش کرلیتا ہے۔ اسلام کی اس طاقت کا راز دعوت ہے۔ دعوت اسلامی طاقت کا لازوال سرچشمہ ہے۔

اقوامِ عالم میں

مصریات کے ایک عالم سر آرتھر کیتھ نے مصر کے بارے میں اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ —— مصریوں کو مسلمانوں کی تلوار نے فتح نہیں کیا بلکہ انھیں قرآن نے فتح کیا :

The Egyptians were conquered not by the sword, but by the Koran.

تاریخ کی کتابوں میں بظاہر یہ لکھا ہوا ملتا ہے کہ خلیفہ ثانی عمر فاروق کے زمانہ میں مسلمانوں کی فوجیں مصر میں داخل ہوئیں اور وہاں رومی سلطنت سے ان کی لڑائی ہوئی۔ اس کے بعد مصر مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ ایسی حالت میں سر آرتھر کیتھ نے ایسا کیوں کہا ہے کہ مصریوں کو مسلمانوں کی تلوار نے فتح نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کے قرآن نے فتح کیا۔

اس کا سبب حکمراں طبقہ اور مصری عوام میں فرق ہے۔ اس وقت مسلم فوجوں سے جو لڑائی ہوئی وہ مصریوں کے ساتھ نہیں تھی بلکہ مصر کے رومی حکمرانوں کے ساتھ تھی۔ یہ مکمل طور پر دو فوجوں کا مقابلہ تھا۔ ایک طرف مسلم فوج تھی اور دوسری طرف رومی فوج۔ یہ مقابلہ میدان جنگ میں شروع ہوا اور میدان جنگ ہی میں ختم ہوگیا۔ تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مسلم فوج کا کبھی بھی کوئی مقابلہ مصری عوام سے پیش آیا ہو۔

اصل یہ ہے کہ جس وقت مسلمان مصر کے اندر داخل ہوئے اس وقت دو بالکل الگ الگ طبقے وہاں پائے جاتے تھے۔ ایک رومی حکمراں، اور دوسرے مصری عوام۔ رومی حکمراں مصر میں بدیشی طبقہ کے طور پر بالکل الگ تھلگ رہتے تھے، ٹھیک اسی طرح جیسے استعمار کے زمانہ میں یورپی قوموں کے لوگ مختلف ایشیائی اور افریقی ممالک میں داخل ہو کر الگ تھلگ گروہ کے طور پر رہنے لگے تھے۔

مسلمانوں کا مقابلہ جب مصر کی سلطنت سے ہوا تو وہ اسی الگ تھلگ رومی طبقہ سے تھا، نہ کہ عمومی طور پر مصری قوم سے۔ مصر کی قوم اس پورے معاملہ میں محض ایک غیر جانب دار مشاہد کی حیثیت رکھتی تھی وہ اصل معرکہ میں شریک نہ تھی۔ یہ شاہی دور کی بات ہے، اور اس کو شاہی دور کے پس منظر میں رکھ کر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

”فتح مصر“ کے نتیجہ میں عملاً جو کچھ ہوا وہ صرف یہ تھا کہ رومیوں کے بنائے ہوئے جس مصری قلعہ میں پہلے رومی فوج رہتی تھی وہاں اب مسلم فوج رہنے لگی۔ یہ محدود معنوں میں ایک سیاسی فرق تھا، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

اس سیاسی یا جنگی واقعہ کے باہر ایک اور واقعہ جو مصر میں پہلے سے ہو رہا تھا اور اب فتح کے بعد مزید اضافہ کے ساتھ جاری ہو گیا، یہ اس زمانہ کے مسلمانوں کی مصر میں آمد تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق مسلمان مختلف ملکوں میں اور مصر میں برابر آ رہے تھے۔ ان آنے والوں میں سیاح اور تاجر اور طالب علم جیسے مسلمان بھی ہوتے تھے۔ مگر اس زمانہ میں ہر مسلمان عملی طور پر داعی اور مبلغ ہوتا تھا۔ چاہے معاشی اعتبار سے وہ کوئی بھی کام کرتا ہو، یہی وجہ ہے کہ ان مسلمانوں کی مصر میں آمد عملی طور پر اسلام کے مبلغین کی آمد بن گئی۔ ان کی سرگرمیاں براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اسلام کی اشاعت کا ذریعہ بن گئیں۔ ان کا ہر قول اور ہر عمل کسی نہ کسی اعتبار سے اسلام کا تعارف ہوتا تھا۔

اس زمانہ میں مسلمانوں کی جنگی نزاع رومیوں کے ساتھ ضرور پیش آئی مگر مصری قوم کے ساتھ انھوں نے کبھی کوئی نزاع نہیں کی۔ وہ مصریوں کے درمیان مکمل طور پر پُرامن پڑوسی بن کر رہنے لگے۔ حتیٰ کہ ایسا بھی نہیں ہوا کہ وہ مصریوں سے یہ مطالبہ کریں کہ تم ہمارے مذہب اور کلچر کو قبول کرو، وہ حسب موقع مصری باشندوں کو اسلام کی باتیں ضرور بتاتے تھے مگر کبھی کسی معاملہ میں مصریوں سے کوئی نزاع یا جنگ نہیں چھیڑی۔

مسلمانوں کا یہ پرامن طریقہ مصریوں کی فطرت کو جگانے کا ذریعہ بن گیا۔ ان کے دل کے بند دروازے کھلنے لگے یہاں تک کہ مصر کے بیشتر باشندے اسلام میں داخل ہو گئے۔

قدیم زمانہ میں جن ملکوں سے مسلمانوں کی لڑائیاں ہوئیں وہ سب اس زمانہ کے قابض حکمرانوں کے خلاف ہونے والی لڑائیاں تھیں نہ کہ ملک کے عوام کے ساتھ ہونے والی لڑائی۔ بیرون ملک کے عوام سے مسلمانوں کا سابقہ پُرامن دائرہ میں پیش آیا۔ مسلمان ان ملکوں میں بے ضرر پڑوسی بن کر رہے۔ وہ حکیمانہ انداز میں اسلام کا پیغام بھی لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ یہی چیز ہے جس نے دورِ اول میں بہت سے ملکوں کو اسلام کے دائرہ میں داخل کر دیا۔

دورِ جدید میں

بیسویں صدی کو اسلام کی مخالف صدی سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں یورپی استعمار نے براہ راست یا بالواسطہ طور پر ہر جگہ اپنا غلبہ قائم کرلیا۔ اس استعمار کو عام طور پر مسلم رہنماؤں نے اسلام دشمن قرار دیا۔ مثال کے طور پر قاہرہ سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے: تصفیۃ الوجود الاسلامی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ صلیبی اور صہیونی طاقتیں اسلام کے وجود کو مٹانے کے لیے سرگرم ہیں۔ مگر یہ بات درست نہیں۔ یہ طاقتیں اگر بالفرض کسی چیز کا تصفیہ چاہتی ہوں تو وہ مسلم قوم ہوگی نہ کہ مذہب اسلام۔

اسلام اپنی ذات میں ایک بالاتر قوت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی نظریاتی عظمت کو کسی بھی حال میں مٹایا نہیں جاسکتا۔ اس کا ایک عملی ثبوت یہ ہے کہ پچھلے سو سال سے بھی زیادہ مدت سے مغربی قوموں اور مسلمانوں کے درمیان سیاسی اور اقتصادی نزاعات جاری تھیں۔ مگر اسی مدت میں اسلام خود مغربی قوموں کے درمیان مسلسل لوگوں کے دلوں کو مسخر کرتا رہا ہے۔

اس سلسلہ میں مغربی ملکوں کے بہت سے لوگوں کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں جنھوں نے عین اس زمانہ میں اسلام قبول کیا جس کو استعمار کا زمانہ یا صلیبیت کے احیاء کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ اس سے پہلے راقم الحروف نے ایک جائزہ کے بعد تقریباً ۲۰ علامتی نام منتخب کیے تھے جنھوں نے انیسویں اور بیسویں صدی میں تقریباً دو سو سال کے درمیان اسلام قبول کیا۔ اصل فہرست اس سے بہت زیادہ ہے۔ ہم نے کچھ نام صرف یہ دکھانے کے لیے منتخب کیے ہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ دعوت اسلام کی کامیابی کس طرح مسلسل طور پر بلا انقطاع بظاہر تاریک ترین دور میں بھی جاری رہی ہے۔ ناموں کی فہرست کے لیے ملاحظہ ہو، دین کامل، صفحہ ۲۳۸۔

اس بارے میں غلط فہمی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ اسلام اور مسلمانوں کے معاملہ کو ایک کرکے دیکھا جائے۔ دیگر قوموں کے ساتھ جو سیاسی اور اقتصادی اور سماجی

جھگڑے پیش آتے ہیں وہ تمام تر مسلمانوں کے ساتھ پیش آتے ہیں نہ کہ اسلام کے ساتھ۔ اگر اس فرق کو سامنے رکھا جائے تو مذکورہ قسم کی تمام غلط فہمیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔

مسلمان کی حیثیت ایک قوم کی ہے۔ ان کے ساتھ دوسری قوموں کو سیاسی اور اقتصادی مسائل پیش آتے ہیں جس کے نتیجہ میں دونوں قوموں کے درمیان نزاعات جاری ہو جاتے ہیں۔ مگر اسلام کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اسلام اپنی فطری اور نظریاتی حیثیت سے ہر آدمی کے دل کی آواز ہے۔ وہ ہر آدمی کی فطرت کا متنٰی ہے۔ جب بھی کسی آدمی کا سابقہ کسی پہلو سے اسلام کے ساتھ پیش آتا ہے تو اس کی فطرت اس کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ وہ خود اپنی اندرونی آواز کے تحت اس سے قریب ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ وہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔

انیسویں اور بیسویں صدی کے درمیان جب مغربی قوموں کو جدید صنعتی طاقت حاصل ہوئی اور وہ سمندروں کو پار کر کے دنیا کے ہر حصہ میں داخل ہو گئیں تو جگہ جگہ ان کا سابقہ مسلمانوں کے ساتھ پیش آنے لگا۔ اس دوران مختلف اعتبار سے ان کا تعارف اسلام کے ساتھ ہونے لگا۔ کہیں انھیں قرآن یا اسلامی لٹریچر ہاتھ آیا۔ کہیں کسی مسلمان کی زبان سے اسلام کے بارے میں کچھ باتیں سننے کا موقع ملا۔ کہیں مسلمانوں کے مخصوص عادات و افعال کو دیکھ کر انھیں اسلام کے بارے میں جاننے کا شوق پیدا ہوا۔ اس طرح اختلاط کے ذریعہ جگہ جگہ اسلام کا دعوتی عمل جاری ہو گیا۔ حتی کہ سو سال کے اندر مغربی ملکوں کے لاکھوں لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

مغربی مستعمرین کی ایک ضرورت یہ تھی کہ وہ اپنی ماتحت قوموں کے مذہب اور کلچر کو جانیں۔ اس بنا پر استشراق کو غیر معمولی فروغ ہوا۔ مغربی علماء بہت بڑی تعداد میں اسلامی لٹریچر اور اسلامی کلچر کا مطالعہ کرنے لگے۔ اس کے ذریعہ ان کے درمیان وسیع پیمانہ پر اسلام کا تعارف پھیلا۔ بہت سے اہل علم یا تو گہرے طور پر اسلام سے متاثر ہوئے مثلاً برطانی اسکالر سر ٹامس کارلائل وغیرہ یا ان کا تاثر یہاں تک بڑھا کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ مثلاً ہنگری کے اسکالر عبد الکریم جرمانوس وغیرہ۔

پُرامن داخلہ

جنوب مشرقی ایشیا کے علاقہ میں ۲۰۰ ملین (۲۰ کرور) مسلمان ہیں۔ صرف انڈونیشیا میں ۱۲۰ ملین مسلمان ہیں۔ یہ تعداد کسی بھی دوسرے مسلم ملک سے زیادہ ہے۔ اس علاقہ میں مسلمانوں کی کثیر تعداد کا سب سے زیادہ اثر انگیز پہلو یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر صرف تبلیغی عمل کے ذریعہ مسلمان ہوئے ہیں۔ اس علاقہ میں کبھی بھی مسلمانوں کی طرف سے کوئی فوجی اقدام نہیں کیا گیا۔

اس علاقہ میں اسلام کا نمایاں ظہور ۱۳ ویں صدی عیسوی میں ہوا۔ اور یہی وہ صدی ہے جس میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت پر زوال آیا۔ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے لکھا ہے کہ جزائر ملایا کی تاریخ پچھلی چھ صدیوں میں اسلامی تاریخ کا نہایت سبق آموز باب پیش کرتی ہے جہاں اسلام کی اشاعت تمام تر صرف تبلیغی کوششوں کے ذریعہ ہوئی (صفحہ ۳۶۷)

۱۳ ویں صدی وہ صدی ہے جب کہ اسپین میں اسلامی سلطنت پر زوال آیا۔ اور یہی وہ صدی ہے جب کہ اسلام جزائر ملایا میں فکری فتح حاصل کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کرافورڈ (Dr. Crawford) نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ بڑا عجیب حسن اتفاق ہے کہ اسلامی مذہب عین اس وقت ایشیا میں بڑھ رہا تھا جبکہ وہ یورپ سے نکال دیا گیا تھا۔

پروفیسر آرنلڈ اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں لکھتے ہیں کہ بعد کے سالوں میں اگرچہ اسلام کی عظیم سلطنت ٹوٹ گئی اور اسلام کی سیاسی طاقت بہت گھٹ گئی تب بھی اس کی فکری اور روحانی فتوحات کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہیں۔ جب منگول قبائل نے ۱۲۵۸ میں بغداد کو تباہ کیا اور عباسی خلافت کی عظمت کو خون میں غرق کر دیا، اور جب فرڈیننڈ نے ۱۲۳۶ میں مسلمانوں کو قرطبہ سے نکال دیا اور غرناطہ کے مسلم سلطان نے عیسائی بادشاہ کو خراج ادا کیا اس وقت اسلام شمالی افریقہ میں اپنی جگہ بنا چکا تھا اور جزائر ملایا میں فاتحانہ اقدام کر رہا تھا۔ سیاسی انحطاط کے لمحات میں اسلام نے اپنی بعض شاندار فکری و روحانی فتوحات حاصل کی ہیں (صفحہ ۲)

وان لیر (Van Lear) نے لکھا ہے کہ جو شخص بھی انڈونیشیا کی تاریخ میں داخل ہوتا

ہے وہ ایک نامعلوم دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی پر اسرار، معجزاتی طاقت کارفرما تھی جس نے جنوب مشرقی ایشیا کے لوگوں کو اسلام میں داخل کر دیا۔

یہ صحیح ہے کہ ایک معجزاتی طاقت اس اشاعتِ اسلام کے پیچھے کام کر رہی تھی۔ مگر یہ کوئی پُر اسرار طاقت نہ تھی بلکہ یہ اسلام کی دعوتی طاقت تھی۔ اسلام کی دعوتی طاقت کے اندر بلاشبہ اس بات کی معجزاتی صلاحیت چھپی ہوئی ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچے اور لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے کے لیے مجبور کر دے۔

اس علاقے میں اسلام تاجروں کے ذریعہ داخل ہوا۔ تاجر کے اندر جو اخلاقیات ہوتی ہیں وہ داعی کی اخلاقیات ہیں۔ بہترین داعی وہی ہے جو تاجر کی طرح مدعو کے ساتھ معاملہ کرے۔ ایسا داعی کبھی اپنے مشن میں ناکام نہیں ہو سکتا۔

الکس ڈی ٹاکویل (Alex de Toqueville) نے لکھا ہے کہ تجارت متشددانہ جذبات کی قاتل ہے۔ تجارت اعتدال اور مفاہمت کو پسند کرتی ہے۔ تاجر آدمی اس معاملہ میں نہایت محتاط ہوتا ہے کہ وہ غصہ سے اعراض کرے۔ تاجر برداشت والا ہوتا ہے۔ تجارت ایک تاجر کے اندر یہی صفات پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے ایک مفکر نے کہا ہے کہ خدا تجارت کو اپنا مبلغ بناتا ہے:

God is making commerce His missionary.

جنوب مشرقی ایشیا کا پورا علاقہ سمندروں کے کنارے آباد ہے۔ اس علاقہ میں مسلمان تاجر کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ وہ سمندروں کے ذریعہ سفر کرتے ہوئے ان ممالک میں پہنچے۔ انھوں نے ان ملکوں میں اپنی تجارتیں پھیلائیں۔ یہاں کی عورتوں سے شادی کی۔ یہاں کے لوگوں کو اپنا شریکِ کار بنایا۔ اس طرح مسلمانوں اور یہاں کے غیر مسلموں کے درمیان ایک مسلسل اختلاط شروع ہو گیا۔

اس اختلاط کے دوران فطری نتیجہ کے طور پر بار بار مسلمانوں کا دین زیرِ بحث آنے لگا۔ مسلمانوں نے ان ملکوں میں داخل ہوتے ہی یہاں کی زبانیں سیکھیں۔ نیز انھوں نے یہاں کے کلچر کو اختیار کر لیا۔ اس طرح معتدل فضا میں اختلاط کے نتیجہ میں اسلام پھیلنے لگا۔

اذان کا نظام

فرانس کے ایک مشہور آرٹسٹ نے اسلام قبول کرلیا۔ اس کا سابق نام برنارڈ جو تھا اور موجودہ اسلامی نام عبدالعزیز رکھا گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مجھے اپنے فن سے عشق تھا۔ اور اس کے لیے میں دنیا کے ملکوں میں کثرت سے سفر کرتا تھا۔ اس سلسلے میں میں مصر گیا۔ اور قاہرہ اور اسکندریہ میں چند روز قیام کیا۔

ایک روز جب کہ میں قاہرہ کی سڑکوں پر چل رہا تھا، میرے کان میں ایک پُرکشش آواز آئی، یہ اذان کی آواز تھی۔ جو مسجد کے میناروں سے بلند ہو رہی تھی۔ اس قسم کی آواز میں نے پہلی بار سنی تھی۔ مجھے مزید جستجو ہوئی، جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ نماز کی پکار ہے تو میں مسجد میں گیا، اور لوگوں کو صف بستہ نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اذان کی آواز اور نماز کے مناظر نے مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ میں فرانس آیا تو میں نے اسلامی لٹریچر تلاش کر کے اسلام کا مطالعہ شروع کردیا۔ میں نے قرآن کی تلاوت کے کیسٹ بھی سنے۔ ان عربی کیسٹوں کو اگرچہ میں سمجھتا نہ تھا مگر ان کا سننا مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس لیے میں ان کو سنتا رہا۔

اس کے بعد میں دوبارہ مصر گیا۔ وہاں میں نے الازہر کے علماء کے سامنے اسلام قبول کرلیا۔ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ سابق "برنارڈ جو" اور موجودہ عبدالعزیز میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اسلامی عقیدے نے میرے طریقے کو بدل دیا ہے۔ تاریکی کے بعد اب میں روشنی میں آگیا ہوں۔ مجھے اپنے اندر ایک ایسا سکون محسوس ہو رہا ہے جس سے میں اس سے پہلے کبھی آشنا نہ تھا۔ اسلام میری روح اور میرے جسم میں خون کی طرح رواں دواں ہے (الدعوۃ ۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ ۳۰ نومبر ۱۹۸۹ء)

اذان کا نظام گویا متوجہ کرنے کا نظام ہے۔ کسی بستی میں مسجد کے اوپر سے جب اذان کی آواز بلند ہوتی ہے تو وہ ایک طرف اہلِ ایمان کو یاد دلاتی ہے کہ فرض نماز کا وقت ہوگیا اب تم نماز کی ادائیگی کی تیاری کرو۔ چنانچہ اہلِ ایمان اپنے کاموں

کو چھوڑ کر نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

اسی کے ساتھ اذان کا ایک عمومی پیغام بھی ہے۔ اذان جب فضا میں بلند ہوتی ہے تو وہ ہر انسان کو غور و فکر کی طرف دعوت دیتی ہے۔ وہ ہر انسان کے اندر تلاش و جستجو کی روح بیدار کرتی ہے۔ "آؤ فلاح کی طرف" کے الفاظ کو سن کر وہ اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ انسانی فلاح کا وہ کون سا راستہ ہے جس کی طرف مسجد کی یہ آواز ہمیں پکار رہی ہے۔ تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات ہیں جب کہ اذان کی آواز نے لوگوں کے اندر تجسس پیدا کیا، وہ تلاش و تحقیق میں لگ گئے یہاں تک کہ ان پر دینِ اسلام کی صداقت کھلی اور وہ اس کے دائرہ میں داخل ہو گئے۔

اذان کا یہ نظام بلاشبہ اپنے اندر ایک عظیم دعوتی پہلو رکھتا ہے۔ مگر اس نظام کا فائدہ صرف اس وقت مل سکتا ہے جب کہ حالات پوری طرح معتدل ہوں، جب کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت اور کشیدگی کی فضا نہ پائی جاتی ہو۔ مسجد کی اذان بذاتِ خود دعوت نہیں ہے، وہ دعوت کی ابتدائی تقریب ہے۔ وہ لوگوں کو دعوت کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ وہ اسلام کے مطالعے کا شوق پیدا کرتی ہے۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہر قیمت پر معتدل فضا باقی رکھی جائے، کسی بھی حال میں اس کو بگڑنے نہ دیا جائے۔

اذان کے اس نظام کو زیادہ مفید اور موثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ساتھ ایک مددگار انتظام بھی موجود ہو۔ جب کسی شخص کے اندر اذان کے ربانی الفاظ سن کر مزید معلومات کا شوق پیدا ہو تو وہاں اسی کے ساتھ ایسا نظام بھی موجود ہو جہاں پہنچ کر وہ اپنے شوق کی تکمیل کر سکے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ہر مسجد میں ایک چھوٹا سا کتب خانہ ہو جہاں اسلام پر تعارفی کتابیں رکھی گئی ہوں۔ مسجد کے لوگ ایسے افراد کا خوش دلی کے ساتھ استقبال کریں اور انھیں اسلامی معلومات بڑھانے میں مدد دیں۔ اسی طرح ہر مدرسہ میں ایسے غیر مسلموں کے کے لیے ایک شعبہ موجود ہو جو ان سے گفتگو کر سکے اور انھیں اسلام سے واقف کرائے۔ اگر یہ مددگار نظام موجود ہو تو ہر جگہ اسلامی دعوت کا کام موثر انداز میں ہونے لگے۔

براہِ راست انداز

مکی دور کے دعوتی واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ عمر بن الخطاب ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان سے ملاقات کی تو فرمایا: اَسْلِم یاابن الخطاب (اے خطاب کے بیٹے، اسلام قبول کرو) تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے بعد عمر بن الخطاب نے کلمۂ شہادت ادا کرکے اسلام قبول کر لیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زبردست ساتھی اور معاون بن گئے۔

دورِ اول میں بہت سے واقعات ملتے ہیں۔ جب کہ اسی طرح ایک شخص کے سامنے برجستہ اور براہِ راست انداز میں اسلام پیش کیا گیا۔ دلیل اور تمہید کا انداز اختیار نہیں کیا گیا۔ یہ برجستہ اور براہِ راست انداز اتنا موثر ثابت ہوا کہ مخاطب نے اسلام قبول کر لیا۔ دورِ اول میں عرب کے اندر اور عرب کے باہر جو لوگ اسلام لائے ان میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی تھی۔

اس کا راز داعی کا یقین ہے۔ یقین اپنی ذات میں دعوت ہے۔ جب کسی انسان کو ایک حقیقت پر گہرا یقین ہو جائے تو اس کے بعد وہ اس کو پیش کرنے کے لیے نہ کوئی تمہید کرتا اور نہ دلیل ڈھونڈتا۔ جو کچھ اس کے سینہ میں ہے اس کو وہ برجستہ انداز میں مخاطب کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ ایسے آدمی کے لیے اس کا یقین ہی اس کے لیے رہنما بن جاتا ہے۔ جس صداقت کو وہ ہمہ تن مانے ہوئے ہے، اس کے متعلق اس کا احساس یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کو بھی اس کو اسی طرح مان لینا چاہیے جس طرح اس نے اس کو مانا ہے۔

تاریخ میں اس کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ اسی طرح کے ایک برجستہ اور یقینی کلام کو سن کر لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ کسی صاحب یقین مسلمان کی گفتگو کسی بادشاہ یا سردار سے ہوئی۔ مسلمان نے اپنے یقین کے زور پر اس کو براہ راست انداز میں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شخص کے اندر ایک

تجسس کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس نے سوچنا شروع کیا کہ اسلام کی وہ کون سی صفت ہے جس نے ایک آدمی کے اندر یہ یقین پیدا کر دیا کہ وہ اس طرح براہ راست انداز میں اسلام کا داعی بن جائے۔ اس تجسس کے بعد فطری طور پر اس نے معلومات حاصل کرنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ اسلام میں داخل ہوگیا۔ اور قدیم رواج کے مطابق، جب وقت کا بادشاہ یا سردار اسلام میں داخل ہوا تو اس کے ماتحت لوگ بھی بڑی تعداد میں اسلام میں داخل ہو گئے۔

برجستگی کا یہ انداز عربوں میں آج بھی باقی ہے۔ مولانا انیس لقمان ندوی جو تقریباً دو سال سے عرب امارات میں ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ عربوں میں انھوں نے عام طور پر یہ مزاج پایا ہے کہ وہ اسلام کی بات کو براہ راست اور بے تکلف انداز میں غیر مسلموں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ مثلاً ابوظبی کے ایک عرب نوجوان احمد عبداللہ العولقی ہیں جو ابوظبی کے رہنے والے ہیں۔ وہ متحدہ عرب امارات کی بحریہ (Navy) میں کام کرتے ہیں (ٹیلی فون 491080) انھوں نے بتایا کہ العولقی کے ساتھ انھیں کئی بار مختلف مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے دیکھا کہ جب کسی اجنبی سے سابقہ پیش آتا ہے تو اکثر وہ پوچھتے ہیں کہ تمہارا مذہب کیا ہے۔ مثلاً جب وہ جواب دیتا ہے کہ مسیحیت تو وہ بے تکلف انداز میں اس سے کہتے ہیں کہ مسیحی کیوں، مسلمان کیوں نہیں:

Why Christian, why not a Muslim?

انھوں نے بتایا کہ میرے علم کے مطابق اس طرح کئی لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اس طرح کا براہِ راست جملہ سن کر انھیں اسلام کے مزید مطالعہ کی رغبت ہوئی اور آخر کار انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔

دعوت اپنی ذات میں ایک طاقت ہے۔ داعی کے پاس اگر اور کچھ نہ ہو تو اس کا یہ یقین ہی اس کا سب سے بڑا ہتھیار بن جاتا ہے کہ اس نے آخری صداقت کو پالیا ہے۔ ایک ایسی صداقت جس کے سوا انسان کے لیے نجات اور کامیابی کا دوسرا کوئی راستہ نہیں۔ یہ یقین اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ سراپا داعی بن جائے، وہ لوگوں کے معاملہ میں غیر جانب دار نہ رہے۔

تاریخ کی زبان سے

قرآن کی سورہ نمبر ۴۸ میں ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ اور وہ اللہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اس کو تمام دین پر غالب کر دے۔ اور اللہ کافی گواہ ہے (ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دینِ الحق لیظھرہ علی الدین کلہ وکفیٰ باللہ شہیداً) الفتح ۴۸

اس آیت میں اظہارِ دین سے مراد دین کا فکری اور نظریاتی غلبہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ جس دینِ فطرت کو بھیجا ہے وہ اپنی ذات میں یہ طاقت رکھتا ہے کہ انسان کو مسخر کر سکے۔ وہ دوسرے تمام افکار پر نظری اور فکری غلبہ حاصل کر لے۔ وکفیٰ باللہ شہیداً کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی سیاسی یا غیر سیاسی طاقت اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اس پیغام کی نظریاتی صداقت اپنے آپ میں اس بات کی ضامن ہے کہ وہ مفتوح و مغلوب نہ ہو، وہ اپنی تسخیری صفت کو کبھی نہ کھوئے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو لوگ اس دعوت سے متاثر ہو کر اس کے دائرہ میں آئے وہ سب وہی تھے جن کو اس دعوت کی نظریاتی صداقت نے مفتوح کیا تھا۔ اس کے بعد عرب سے باہر کے ملکوں میں اسلام کو جو پھیلاؤ حاصل ہوا وہ بھی اسی نظریاتی قوت سے ہوا نہ کہ شمشیری قوت سے (اس کی تفصیل پروفیسر آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام میں دیکھی جا سکتی ہے)

اس معاملہ کی تاریخی مثال تاتاریوں کا واقعہ ہے۔ یہ وحشی قبائل تھے جو عباسی خلافت کے آخری زمانہ میں ترکستان سے نکلے اور سمرقند سے لے کر حلب تک مسلم دنیا کو تاراج کر ڈالا۔ انھوں نے عباسی سلطنت کو ختم کر دیا اور مسجدیں، کتب خانے اور دوسرے دینی ادارے ہزاروں کی تعداد میں تباہ کر دیے۔ ان کا سیاسی رعب اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اس زمانہ میں کہا جانے لگا: اذا قیل لک ان التتر انھزموا فلا تصدّق (اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاری شکست کھا گئے تو تم اس کو نہ ماننا)

مگر صرف پچاس سال کے اندر یہ معجزاتی واقعہ ہوا کہ بیشتر تاتاری اپنے قبائلی دین کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو گئے۔ جو لوگ پہلے اسلام کے دشمن تھے وہ اسلام کے دوست اور حامی بن گئے۔ یہ معجزہ کیوں کر پیش آیا، وہ اس طرح پیش آیا کہ تاتاریوں نے سیاسی غلبہ حاصل کرنے کے بعد بہت بڑی تعداد میں مسلمان عورتوں اور مردوں کو پکڑا اور ان کو اپنے گھروں میں خدمت گار کے طور پر رکھ لیا۔

ان خدمت گار مسلمان عورتوں اور مردوں سے نیز علاقہ کے دوسرے مسلمانوں سے تاتاریوں کا جو اختلاط ہوا اس کے نتیجہ میں ایسا ہوا کہ اسلام کی باتیں مسلسل طور پر تاتاریوں کے علم میں آنے لگیں۔ اسلام کی یہ خدائی تعلیمات جو فطرت پر مبنی تھیں انھوں نے تاتاریوں کو متاثر کرنا شروع کیا۔ انھیں واضح طور پر نظر آنے لگا کہ ان کے قبائلی کلچر اور مذہب کے مقابلہ میں اسلام ہر اعتبار سے زیادہ بہتر ہے۔ اس کے نتیجہ میں ایسا ہوا کہ دھیرے دھیرے ان کی بیشتر تعداد نے اسلام قبول کر لیا۔

خدا کے دین کے داعی کے لیے یہ ایک عظیم بشارت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی حیثیت ایک نظریاتی سپر پاور کی ہے، جو ہر دوسری سپر پاور پر غالب آنے کی طاقت رکھتی ہے۔ خواہ وہ سیاسی سپر پاور ہو یا اقتصادی سپر پاور یا عسکری سپر پاور۔ اسلام کامل صداقت ہونے کی بنا پر اپنے آپ میں یہ صفت رکھتا ہے کہ وہ انسان کی فطرت میں اپنی جگہ بنائے، وہ انسان کو اندر سے مسخر کرے اور جس نظریہ میں انسان کو اندر سے مسخر کرنے کی طاقت ہو اس نظریہ کے پھیلاؤ کو روکنا کسی بھی طاقت کے لیے ممکن نہیں۔

اسلام کی یہ صفت داعی کے لیے یقین و اعتماد کا سرچشمہ ہے۔ وہ اس یقین کے ساتھ اٹھتا ہے کہ خارجی حالات خواہ بظاہر کتنے ہی مخالف ہوں اور دوسری طاقتوں نے بظاہر خواہ کتنا ہی زیادہ زور حاصل کر لیا ہو وہ کسی بھی حال میں داعی کے مشن میں رکاوٹ بننے والے نہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر داعی کو یہ یقین ہوتا ہے کہ اس کے ربانی مشن کے لیے ہر مشکل غذا کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے دشمن بھی امکانی طور پر اس کے دوست ہیں۔ دعوت اس کے لیے ایک ایسا برتر حل بن جاتی ہے جو تمام مشکلات و مسائل پر فائق ثابت ہو۔

فطری سادگی

ایک مسلمان اپنے گھر کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اتنے میں ایک شخص وہاں آیا۔ اس نے کہا کہ میں گورکھ پور کا ایک برہمن ہوں۔ میرے دل میں کئی سال سے ایک کھٹک ہے۔ میں نے بہت سے پنڈتوں اور پادریوں سے پوچھا۔ مگر مجھے اطمینان نہ ہو سکا۔ میں اس تلاش میں ہوں کہ آدمی کے لیے نجات کا ذریعہ کیا ہے۔ مسلمان نے کہا کہ نجات کا راستہ ہے — خدا کو ایک ماننا، آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر تسلیم کرنا۔ اور ان کے بتائے ہوئے راستے کے مطابق، آخرت کی فکر کرنا۔ برہمن نے کہا کہ میں اسلام کی ان تینوں باتوں کو مانتا ہوں۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اتنے میں مغرب کی اذان کی آواز آئی۔ اللہ اکبر اللہ اکبر کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ مسلمان نے کہا کہ چلئے مسجد میں چل کر نماز پڑھ لیں۔ انھوں نے کہا کہ میں کیسے نماز پڑھوں گا میں تو ایک غیر مسلم ہوں۔ مسلمان نے کہا کہ جب آپ اسلام کی ان تین بنیادی باتوں (توحید، رسالت، آخرت) کا اقرار کرتے ہیں تو آپ مسلم ہیں وہ راضی ہو گئے اور وضو کر کے مسلمان کے ساتھ مغرب کی نماز میں شریک ہو گئے (ملی جمعیۃ ۱۵ اپریل ۱۹۸۹)

اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کس قدر سادہ مذہب ہے۔ اسلام کی یہ سادگی ہی اسلام کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اسلام اتنا زیادہ سادہ مذہب ہے کہ ہر مسلمان اس کو سمجھ سکتا ہے۔ وہ اتنا فطری مذہب ہے کہ کوئی بھی شخص جو اس کو خالی الذہن ہو کر سنے وہ فوراً اس کے دل کو اپیل کرے گا۔

اسلام کے پھیلنے میں رکاوٹ صرف اس وقت ہوتی ہے جب کہ اسلام کو سننے اور سمجھنے کے لیے معتدل فضا باقی نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اگر اجنبیت حائل نہ ہو، اور ان کے درمیان تناؤ کا ماحول ختم ہو جائے تو منظم تبلیغی کوشش کے بغیر اپنے آپ اسلام کی تبلیغ ہونے لگے۔ مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان روزانہ کا عام میل جول ہی اسلام کی اشاعت کا ذریعہ بن جائے۔

دوسرے مذاہب جو آج دنیا میں پائے جاتے ہیں ان میں عقائد اور عبادت کا نظام اتنا پیچیدہ ہے کہ صرف اعلیٰ تربیت یافتہ (علماء) ہی اس کی تبلیغ کر سکتے ہیں۔ اسلام کا معاملہ بالکل اس سے مختلف ہے۔ اسلام ایک انتہائی سادہ اور کامل طور پر ایک فطری مذہب ہے۔ اس لیے ہر مسلمان اس کی تبلیغ کر سکتا ہے۔ ہر مسلمان اس کی اشاعت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

ہزاروں لوگ جو ہر روز دنیا کے مختلف حصوں میں اسلام قبول کرتے ہیں ان کا معاملہ زیادہ تر یہی ہے۔ وہ کسی تربیت یافتہ مبلغ کی تبلیغ سے اسلام میں داخل نہیں ہوتے بلکہ بیشتر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے میل جول کے درمیان انھیں اسلام کی تعلیم کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس سے ان کے اندر تلاش کا جذبہ جاگتا ہے۔ اس کے بعد وہ قرآن یا دوسری اسلامی کتابیں پڑھتے ہیں یہاں تک کہ مزید متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیتے ہیں۔

اسلام کی پوری تاریخ میں یہی فطری عمل جاری رہا ہے۔ ہر دور میں اور ہر مقام پر یہی ہوا ہے کہ روزمرہ کے انسانی اور سماجی تعلقات کے درمیان لوگوں کو اسلام کا تعارف ملتا رہا اور وہ اسلام کو اپنے دل کی آواز پاکر اس کو قبول کرتے رہے۔ یہ عمل اگر کبھی عارضی طور پر رُکا ہے تو صرف اس وقت جب کہ کسی وجہ سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تلخی پیدا ہو گئی۔ اور اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ معتدل حالات میں دونوں گروہوں کا ملنا جلنا ختم ہو گیا۔

اسلام کا اصل دعوتی مسئلہ تعارف کا ہے نہ کہ قبولیت کا۔ تعارف کا کام اگر معتدل حالات میں انجام پا رہا ہو تو اس کے بعد قبولیت اپنے آپ آتی ہے۔ یہاں تعارف اور قبولیت میں کوئی فاصلہ نہیں۔

جب بھی ایسا ہو کہ تعارف اور قبولیت میں فاصلہ پیدا ہو جائے تو پیشگی طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ صحیح فضا نہ ہونے کی بنا پر تعارف اپنی صحیح صورت میں نہیں ہو رہا ہے اس لیے بظاہر تعارف کے باوجود لوگوں نے اسلام سے دوری اختیار کر رکھی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کی غلط تصویر ہی اسلام کی قبولیت کی راہ میں واحد رکاوٹ ہے۔ اگر لوگوں کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر آجائے تو وہ اسلام کی طرف اس طرح دوڑ پڑیں گے جس طرح پیاسا آدمی پانی کی طرف۔

خدا کی طرف سے جتنے دین آئے وہ سب سادہ اور فطری تعلیمات ہی پر مشتمل تھے۔ بعد کے زمانے میں ان مذہبوں میں انسانی ملاوٹ شامل ہوگئی اس طرح ان مذاہب نے اپنی سادگی کھودی، وہ انسانی فطرت کے غیر مطابق ہو کر رہ گئے۔

اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر قسم کی انسانی ملاوٹ سے پاک ہے اس لیے اس کی فطری سادگی بدستور قائم ہے۔ اسلام کی اس خصوصیت نے اس کو ایک ایسا واحد دین بنادیا ہے جو انسانی فطرت سے کامل مطابقت رکھتا ہے۔ انسان کی فطرت اور اسلام میں کسی قسم کی کوئی دوری حائل نہیں۔

امکاناتِ دعوت

دورِ یُسر

قرآن کی سورۃ نمبر ۲ میں اس وقت کے اہل ایمان کو یہ دعا سکھائی گئی کہ ـــــ اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے ڈالا تھا ہم سے اگلوں پر۔ اے ہمارے رب ہم سے وہ نہ اٹھوا جس کی طاقت ہم کو نہیں۔ اور در گزر کر ہم سے۔ اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم کر۔ تو ہمارا کارساز ہے۔ پس انکار کرنے والوں کے مقابل میں ہماری مدد فرما (البقرہ ۲۸۶)

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ جب وہ کسی گروہ کے لیے کسی خصوصی عطیہ کا فیصلہ فرماتا ہے تو پیشگی طور پر اس کو مذکورہ گروہ کی زبان پر دعا کی صورت میں جاری کرتا ہے۔ یہی معاملہ اس دعا کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ تھا کہ بعد کے داعیانِ حق کے لیے دعوتی ذمہ داریوں کو ادا کرنا آسان ہو جائے۔ وہ دعوت کے کام کو نسبتاً سہولت کے ماحول میں انجام دے سکیں جس کو پچھلے لوگ صرف مشکل حالات میں انجام دیتے تھے۔

پچھلے چودہ سو سال میں تدریج کے ساتھ تسہیل کا یہ عمل مسلسل جاری رہا یہاں تک کہ اب بیسویں صدی کے آخر میں یہ تدریجی عمل اپنی آخری حد کو پہنچ چکا ہے۔ موجودہ زمانہ کے اہل ایمان کے لیے اب آخری طور پر یہ ممکن ہو گیا ہے کہ وہ دعوت کے کام کو انتہائی آسانی کے ساتھ انجام دے سکیں، اس اعتبار سے پچھلا دور اگر دورِ عُسر تھا تو موجودہ دور گویا دورِ یُسر ہے۔

دعوت کی تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم زمانہ کے داعیوں کو مغلوبیت کے حالات میں دعوت کا کام انجام دینا پڑا تھا۔ اس کے بعد اہل باطل پر اہلِ توحید کو غلبہ حاصل ہوا، انھیں ماحول کے اندر غالب حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس طرح بعد کے دور میں یہ ممکن ہو گیا کہ حق کی دعوت کو غلبہ کے ماحول میں انجام دیا جا سکے۔ اسی طرح تاریخ بتاتی ہے کہ ابتدائی دور کے اہل ایمان کو محتاجی کے ماحول میں دعوت کا کام کرنا پڑا تھا۔ اس کے بعد فتوحات ہوئیں اور حالات بدلے یہاں تک کہ انھیں یہ موقع ملا کہ وہ خوش حالی کے ماحول میں دعوت کا کام کر سکیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس طرح بتدریج ہر اعتبار سے دعوت الی اللہ کا کام مشکل سے آسانی کی طرف سفر کرتا رہا ہے۔ جس پہلو سے بھی جائزہ لیا جائے یہی خدائی منصوبہ تاریخ میں عمل کرتا ہوا دکھائی دے گا۔

قدیم زمانہ میں توحید کی دعوت کا کام مذہبی جبر کے ماحول میں انجام دینا پڑتا تھا۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ ہوا کہ مذہبی جبر کے دو سب سے بڑے عالمی ستون ساسانی امپائر اور بازنطینی امپائر کو اہلِ ایمان نے توڑ دیا۔ اس کے بعد مذہبی آزادی کا دور شروع ہوا جو اپنی فطری رفتار سے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ موجودہ زمانہ میں عالمی سطح پر یہ مان لیا گیا کہ مذہبی آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ اس طرح یہ ممکن ہو گیا کہ جس دعوت کے کام کو پہلے مذہبی جبر کے ماحول میں کرنا پڑتا تھا اس کو اب مذہبی آزادی کے ماحول میں انجام دیا جائے۔

قدیم زمانہ میں سفر اور ابلاغ کے ذرائع بہت محدود تھے۔ داعی کے لیے دور کے علاقوں کا سفر کرنا بہت دشوار تھا۔ اسی طرح اس کی بھی کوئی سبیل موجود نہ تھی کہ داعی اپنی آواز کو دور کے مقامات تک پہنچا سکے۔ بعد کے زمانہ میں بحری سفر نے اس کام میں کافی آسانی پیدا کر دی۔ موجودہ زمانہ میں (communication) کے جدید ذرائع نے اس آسانی کو آخری حد تک پہنچا دیا۔ اب داعی کے لیے تیز رفتار سفر بھی آسان ہو گیا اور اپنی آواز کو دور دراز مقامات تک پہنچانا بھی۔

قدیم زمانہ کا انسانی علم زیادہ تر قیاسات اور توہمات پر مبنی تھا۔ چنانچہ وہ دینِ حق کے لیے ایک مستقل ذہنی رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ موجودہ زمانہ میں ایک نیا انقلاب آیا جبکہ انسانی علم کو حقائقِ فطرت کی بنیاد پر تشکیل دیا گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ موجودہ زمانہ کا انسانی علم دینِ حق کی تصدیق کے ہم معنی بن گیا، وغیرہ۔

دعوت کی تاریخ اب دورِ عُسر سے نکل کر دورِ یُسر میں پہنچ گئی ہے۔ یہ ایک خدا داد نعمت ہے۔ اب داعی کے لیے ممکن ہو گیا ہے کہ وہ اس دعوتی عمل کو یُسر کے ماحول میں انجام دے سکے جس کو پہلے صرف عُسر کے ماحول میں انجام دینا پڑتا تھا۔

دینِ فطرت

قرآن میں ہے کہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ ان کے بارے میں قرآن میں بتایا گیا ہے کہ — اور جب وہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ بے شک یہ حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم تو پہلے ہی سے اس کو ماننے والے تھے (القصص ۵۳)

اسلام فطرت کا دین ہے۔ وہ انسانی فطرت کی پکار ہے۔ اگر آدمی کی فطرت پر مصنوعی پردے نہ پڑے ہوئے ہوں تو وہ اسلام کو پاتے ہی اس کو پہچان لے گا۔ اور اس کو اپنی چیز سمجھ کر فوراً قبول کرے گا۔ اسلام اور انسانی فطرت دونوں ایک دوسرے کا مثنیٰ (counterpart) ہیں۔ حقیقی انسان اور حقیقی اسلام کے درمیان کوئی دوری یا اجنبیت نہیں۔

اسلام کی یہ صفت اس کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اس نے اسلامی دعوت کو اس کے داعیوں کے لیے ایک آسان کام بنا دیا ہے۔ گویا کہ اسلام کا داعی دوسروں کو وہی چیز دیتا ہے جس کا وہ پہلے ہی سے انتظار کر رہے ہیں۔ فارسی شاعر کا یہ شعر اس معاملہ پر پوری طرح صادق آتا ہے:

ہمہ آھوان صحرا سر خود نہادہ بر کف   بہ امید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

یہی وجہ ہے کہ اسلام بعد کے دور میں کسی خاص تبلیغی کوشش کے بغیر ساری دنیا میں پھیل گیا۔ بے شمار لوگوں نے اس کو اپنے دل کی آواز سمجھ کر اسے قبول کر لیا۔ اس کی مثالیں کثرت سے پچھلے زمانوں میں بھی پائی جاتی ہیں اور موجودہ زمانہ میں بھی۔

موجودہ زمانہ میں مختلف ملکوں میں جو لوگ اسلام کو قبول کر رہے ہیں ان کے تاثرات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ کے ایک تعلیم یافتہ شخص مسٹر گیری ملر (Gary Miller) نے اسلام قبول کیا۔ وہ پہلے عیسائی تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے کیوں اپنے مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے مذہب کو نہیں بدلا ہے بلکہ میں اپنے مذہب کی طرف واپس (revert) آیا ہوں۔

اس واقعہ نے اسلامی دعوت کے حق میں ابدی طور پر ایک موافق امکان پیدا کردیا ہے۔ انسان ہمیشہ ایک ہی فطرت پر پیدا ہوتے ہیں۔ ایک انسان اور دوسرے انسان میں ظاہری اعتبار سے کچھ فرق ہو سکتا ہے مگر پیدائشی فطرت کے اعتبار سے ایک انسان اور دوسرے انسان میں کوئی فرق نہیں (لاتبدیل لخلق اللہ) اس کا مطلب یہ ہے کہ دورِ اول کے انسان کے لیے اسلام میں جو اپیل تھی وہی اپیل دورِ آخر کے انسان کے لیے بھی باقی رہے گی۔ اس معاملہ میں نہ زمانہ کے اعتبار سے کوئی فرق ہونے والا ہے اور نہ جغرافیہ کے اعتبار سے۔

قدیم دور کو روایتی دور کہا جاتا ہے۔ اور جدید دور کو سائنسی دور۔ مگر اسلامی دعوت کے اعتبار سے یہ تقسیم تمام تر اضافی ہے۔ روایتی دور ہو یا سائنس کا دور یا سپر سائنس کا دور، ہر دور میں انسان کی فطرت ایک ہی رہتی ہے۔ اسلام کا داعی بعد کے دور میں بھی اسی یقین کے ساتھ اسلام کی دعوت کو لے کر اٹھ سکتا ہے جس طرح اس سے پہلے صحابہ اور تابعین اسلام کی دعوت کو لے کر اٹھے اور عزم و یقین کے سرمایہ کے بل پر پوری آباد دنیا میں اس کو پہنچا دیا۔

کسی کام کی کامیابی کے لیے سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ اس کے کارکن یقین و اعتماد کے جذبہ سے بھرے ہوئے ہوں۔ انھیں پیشگی طور پر یہ یقین ہو کہ وہ جس پیغام کو لے کر اٹھے ہیں اس کو بہر حال کامیاب ہونا ہے، اس کی کامیابی کو کوئی روکنے والا نہیں۔ اسلامی دعوت کو یہ خصوصیت کمال درجہ میں حاصل ہے اور اس کی یہی خصوصیت اس کی کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دور اول میں صحابہ اور تابعین اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں پھیل گئے۔ حالاں کہ وہاں کا کلچر، وہاں کی زبان، اور ہر چیز بالکل مختلف تھی۔ ان کے اس دعوتی اقدام کا راز یہ تھا کہ انھیں یقین تھا کہ بظاہر خواہ کتنے ہی اختلافات ہوں انسان کی حقیقی فطرت ایک ہی دین کی طالب ہے، اور وہ عین اسی مطلوب دین کا تحفہ لے کر ان کے یہاں جا رہے ہیں۔

خدا کی نشانیاں

قرآن کی سورۃ نمبر ۲۷ میں بتایا گیا ہے کہ ــــ اللہ تم کو اپنی نشانیاں دکھائے گا تو تم ان کو پہچان لوگے (النمل ۹۳) دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں بھی اور خود ان کے اندر بھی۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے (حم السجدہ ۵۳)

ان آیتوں میں یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کہ بعد کے زمانہ میں ایسی مادی نشانیاں ظاہر ہوں گی جو قرآنی حقیقتوں کو قابل فہم بنائیں گی۔ اس کے بعد یہ حقیقتیں اس حد تک واضح ہو جائیں گی کہ لوگوں کے لیے ان کو ماننے بغیر چارہ نہ رہے۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی دریافتوں کے بعد یہ پیشین گوئی آخری حد تک پوری ہوگئی ہے۔

خدا کا عقیدہ پہلے صرف ایک غیبی عقیدہ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن موجودہ زمانہ میں جو حقیقتیں دریافت ہوئی ہیں انھوں نے اس غیبی عقیدہ کو مشاہدہ کے قریب پہنچا دیا ہے۔ کائنات میں دریافت ہونے والی جدید نشانیاں ایسی کھلی دلیلیں بن گئی ہیں جس کے بعد خدا کو ماننا اتنا ہی یقینی بن گیا ہے جتنا کہ دکھائی دینے والی چیزوں کو ماننا (اس معاملہ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب: مذہب اور جدید چیلنج)

اسی طرح قیامت اور آخرت کے بارہ میں قرآن میں جن باتوں کی خبر دی گئی ہے وہ آج واقعہ کے روپ میں دکھائی دینے لگی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں فطرت کے رازوں کے انکشاف نے انسان کو ایسی چیزوں کا تجربہ کرایا ہے جو آخرت کی حقیقتوں کو انتہائی حد تک قابل فہم بنا دیں۔ جس انسان کے اندر سنجیدگی ہو اور وہ سبق لینے کا مزاج رکھتا ہو اس کے لیے یہ نئی دریافتیں اتنا زیادہ کافی ہیں کہ ان کے بعد آخرت پر یقین کرنے کے لیے اس کو کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔

مثلاً قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جب موجودہ دنیا ختم ہوگی اور آخرت کا دن آئے گا تو زمین بولنے لگے گی اور تمام باتوں کو بتا دے گی (يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا) قرآن کی یہ خبر

پہلے کسی کو عجیب معلوم ہو سکتی تھی۔ پہلے کوئی شخص یہ سوچ سکتا تھا کہ زمین تو ایک بے جان مادہ ہے پھر ایک ایسی مادی چیز کیسے بولنے لگے گی۔ لیکن موجودہ زمانہ میں مادہ کا بولنا ایک عام مشاہدہ کی چیز بن گیا ہے۔

آپ ایک ریڈیو سیٹ لیں یا ایک ٹیپ ریکارڈر لیں جس میں کیسٹ لگا ہوا ہو۔ پھر اس کو اپنی میز پر رکھیں۔ بظاہر یہ ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈر مکمل طور پر خاموش ہو گا۔ وہ آپ کو ایک بے زبان مادہ دکھائی دے گا۔ لیکن جب آپ ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ دباتے ہیں تو اچانک دونوں بولنے لگتے ہیں۔ ان کے اندر سے بامعنی آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ موجودہ زمانہ کی یہ دریافت گویا قرآن میں دی ہوئی خبر کا ایک عملی مظاہرہ ہے۔ وہ مستقبل میں ظاہر ہونے والی حقیقت کا پیشگی مشاہدہ ہے۔ ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر انسان کو بتا رہے ہیں کہ قیامت میں زمین کیسے بولے گی اور کس طرح ان واقعات کے بارے میں اپنا بیان دے گی جو اس کے اوپر پیش آئے تھے۔

اسی طرح قرآن میں جنت کے بارے میں خبر دی گئی ہے۔ قرآن میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ جنت میں انسان کو کیسی اعلیٰ نعمتیں حاصل ہوں گی۔ قدیم زمانہ میں جنت کا یہ تذکرہ صرف ایک نظری اطلاع کی حیثیت رکھتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں جدید ٹکنالوجی کے ذریعہ جو مادی رونقیں سامنے آئی ہیں ان کے بعد یہ اطلاع صرف اطلاع نہیں رہی بلکہ وہ ایک قسم کا مشاہدہ بن گئی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے جو نئی اور پُر رونق دنیا بنی ہے وہ گویا جنت کا ایک بعید تعارف ہے۔ اس جدید دنیا میں انسان جنت کو دور کی ایک جھلک کے روپ میں دیکھ رہا ہے۔ اس طرح جو چیز پہلے صرف عقیدہ کی حیثیت رکھتی تھی، وہ آج مشاہدہ کی نوعیت کی ایک چیز بن گئی ہے ——— ایک انجینیر کو مکان بنانا ہو اور وہ اس کی نظری وضاحت کے ساتھ اس کا ایک عملی ماڈل بھی تیار کر کے سامنے رکھ دے تو لوگوں کے لیے انجینیر کے بیان کو سمجھنا بہت زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح آج کا داعی اس پوزیشن میں ہے کہ وہ قرآنی حقیقتوں کی لفظی خبر دینے کے ساتھ ان کا عملی نقشہ بھی دکھا دے۔

تاریخی تصدیق

ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیائے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو تھے۔ وہ کئی زبانیں جانتے تھے۔ ان کا تعلق اس مشہور بنگالی خاندان سے تھا جس کی ایک فرد سروجنی نائیڈو تھیں۔ اپنے آخری زمانہ میں وہ حیدرآباد میں مقیم ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر چٹوپادھیائے کو سچائی کی تلاش ہوئی۔ پہلے انھوں نے فلسفہ پڑھا مگر فلسفہ انھیں تسکین نہ دے سکا۔ اس کے بعد انھوں نے مذاہب کا مطالعہ شروع کیا۔ انھوں نے تمام بڑے بڑے مذاہب کو پڑھ ڈالا۔ مذاہب میں انھیں کسی قدر روحانی تسکین ملتی تھی مگر وہ خالص علمی ذہن کے آدمی تھے۔ چنانچہ ہر مذہب کے مطالعہ کے بعد ان کا ذہن اس سوال پر اٹک جاتا تھا کہ اس مذہب کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔ تمام مذاہب ان کو تاریخی اعتبار سے غیر معتبر دکھائی دیتے تھے۔ کسی بھی مذہب کی کتاب یا اس کی شخصیت تاریخ کے معیار پر ثابت شدہ نظر نہیں آتی تھی۔

آخر میں انھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا۔ اسلام انھیں نہ صرف اپنی تعلیمات کے اعتبار سے مکمل نظر آیا بلکہ انھوں نے پایا کہ خالص تاریخی اعتبار سے اس کے تمام اجزا معتبر اور ثابت شدہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے حیدرآباد میں اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد انھوں نے ۲۶ اگست ۱۹۰۴ کو حیدرآباد میں ایک لکچر دیا جس کا عنوان یہ تھا کہ میں نے کیوں اسلام قبول کیا:

Why Have I Accepted Islam

اس لکچر میں انھوں نے بتایا کہ دوسرے مذاہب کو جب میں نے پڑھا تو اس کی شخصیتیں مجھ کو تاریخ سے زیادہ مائتھالوجی نظر آئیں۔ میں اپنے علمی ذوق کی بنا پر ان کو قبول نہ کر سکا۔ آخر میں میں نے اسلام کو اور پیغمبر اسلام کو پڑھا تو مجھے کامل اطمینان ہو گیا۔ یہاں مجھے ہر چیز تاریخ کے معیار پر ثابت شدہ نظر آئی۔ اس کی تفصیل بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اُف، یہ پانا بھی کیسا اطمینان بخش ہے کہ آخر کار آدمی ایک ایسے تاریخی پیغمبر کو پالے جس پر وہ یقین کر سکے :

Oh! What a relief to find, after all, a truly historical prophet to believe in.

قدیم زمانہ میں مذہب کو صرف تقدس کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ بحث نہیں کی جاتی تھی کہ اس کی کتاب یا اس سے وابستہ شخصیتیں تاریخی طور پر مسلّم ہیں یا نہیں۔ باعتبار حقیقت دوسرے تمام مذاہب غیر تاریخی تھے۔ یعنی ان کی بنیاد عقیدہ پر قائم تھی نہ کہ حقائق پر۔ اسلام استثنائی طور پر اس خصوصیت کا حامل تھا کہ اس کی ہر چیز تاریخی طور پر ثابت شدہ تھی۔ مگر اسلام کی یہ ابتدائی صفت لوگوں کی نگاہوں سے چھپی ہوئی تھی۔ کیوں کہ اس پہلو سے مذاہب کا جائزہ لینے کا رواج ہی دنیا میں نہیں تھا۔

جدید سائنسی انقلاب نے لوگوں کے اندر ایک نئی روح تجسس (spirit of enquiry) پیدا کی۔ اب ہر چیز کا جائزہ خالص علمی حقائق کی بنیاد پر لیا جانے لگا۔ یہ جائزہ عین اسلام کے حق میں تھا۔ اس کے نتیجہ میں خالص علمی طور پر یہ واضح ہو گیا کہ دوسرے مذاہب کو تاریخی اعتباریت (historical credibility) حاصل نہیں۔ یہ صرف اسلام ہے جو اس تاریخی معیار پر پورا اتر رہا ہے۔

دور جدید کی علمی دنیا میں یہ جو تبدیلی ہوئی ہے اس نے اسلامی دعوت کے لیے نئے طاقت ور مواقع کھول دیے ہیں۔ ان مواقع کو اگر بھرپور طور پر استعمال کیا جائے تو ہزاروں لوگوں کا دل اس حقیقت کی گواہی دے گا جس کی ایک مثال ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیائے کی صورت میں نظر آتی ہے۔

دورِ جدید میں اسلامی دعوت کے لیے بہت سے نئے مواقع کھلے ہیں، ایسے مواقع جو اس سے پہلے تاریخ میں کبھی موجود نہ تھے۔ یہ اللہ کا خصوصی انتظام ہے تاکہ اس کا دین ہر آنے والے دور میں نئی طاقت کے ساتھ لوگوں کو اپنی طرف کھینچ سکے۔

یہ ایک خدائی امکان ہے۔ خدا نے تاریخ میں غیر معمولی عمل کر کے وہ حالات پیدا کیے جس کے نتیجہ میں ایسا امکان سامنے آیا۔ یہ امکان کوئی سادہ بات نہیں، وہ خدا کی مرضی کو بتاتا ہے۔ یہ اس بات کا ایک زندہ اشارہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں خدا کی مرضی یہ ہے کہ اہل اسلام مزید اضافہ کے ساتھ دین حق کی دعوت کے لیے سرگرم ہوں، وہ پہلے سے بھی زیادہ توجہ اور لگن کے ساتھ اس اہم کام میں اپنے آپ کو لگا دیں۔

حج کی دعوتی اہمیت

قدیم مکہ میں حج کے موسم میں عرب کے قبیلے مکہ آتے تھے اور وہاں اپنے خیمے لگاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس اجتماع کو دعوت کے لیے استعمال فرماتے تھے۔ آپ ان کے خیموں میں جاتے، ان کے سامنے اسلام پیش کرتے اور قرآن کی آیتیں پڑھ کر سناتے (فعرض علیھم الاسلام و تلا علیھم القرآن) اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریقہ تھا کہ حج کے اجتماع کو دعوتی مقصد کے لیے استعمال کیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں یہ امکان پیدا ہو چکا ہے کہ حج کے عمل کو مزید اضافہ کے ساتھ دعوت کا عمل بنا دیا جائے۔ ٹی وی کی ایجاد نے حج کے اجتماع کو ایک عالمی اہمیت دے دی ہے۔ حج کے زمانہ میں سعودی حکومت کی طرف سے حج کے تمام مقامات پر بڑے بڑے ٹاور لگا دیے جاتے ہیں جن میں ویڈیو کیمرے نصب ہوتے ہیں۔ یہ کیمرے حج کے تمام مراسم اور اس کی تمام سرگرمیوں کی تصویریں لیتے رہتے ہیں جو اسی وقت ٹی وی اسٹیشن سے ٹیلی کاسٹ کیا جاتا ہے۔ پھر دنیا بھر کے ٹی وی اسٹیشن اس کو لے کر دوبارہ اپنے اپنے ملکوں میں دکھاتے ہیں۔ رپورٹیں بتاتی ہیں کہ ہر ملک کے لوگ حج کے ان مناظر کو نہایت شوق سے ٹی وی پر دیکھتے ہیں۔

اس طرح حج مشاہدہ کے اعتبار سے صرف ایک مقامی چیز نہیں رہا بلکہ اب اس نے ایک عالمی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ دور اول میں حج کے اجتماع کو مقامی سطح پر اسلام کی دعوت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ اس اجتماع کو اسلام کی عالمی دعوت کے لیے استعمال کیا جائے۔

دور اول میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کو مقامی سطح پر دعوت دینے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ آج جدید ترقیوں کے بعد اہل اسلام اس پوزیشن میں ہو گئے ہیں کہ وہ حج کے دنوں کو دعوت اسلام کے سالانہ پیغام رسانی کے دن بنا دیں۔ ان چند دنوں میں وہ تمام قوموں کو دعوت حق کا مخاطب بنالیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے اجتماع کو گویا

دعوت کا اسٹیج بنا دیا تھا۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں مزید اضافہ کے ساتھ یہ امکان پیدا ہوا ہے کہ حج کے اجتماع کو دعوت کا اسٹیج بنا دیا جائے۔

حج کے موقع پر ساری دنیا کے مسلمان اکٹھا ہوتے ہیں۔ اور دو ملین سے زیادہ کی تعداد میں حج کے مراسم ادا کرتے ہیں۔ اتنے زیادہ انسانوں کا مل کر ایک عمل کرنا عجیب اثر انگیز منظر پیدا کرتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں لوگ جب مل کر کہتے ہیں کہ لبیک، اللھم لبیک (میں حاضر ہوں، خدایا میں حاضر ہوں) تو یہ ایک عجیب طوفان خیز سماں ہوتا ہے جس کو دیکھ کر لوگوں کے دل ہل جائیں اور آنکھیں اشکبار ہو جائیں۔

اسی طرح امام جب اپنے خطبہ میں وہ الفاظ دہراتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمائے تھے — کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں، کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت نہیں۔ تو حج کے ماحول میں یہ گویا ایک آسمانی اعلان بن جاتا ہے۔ لوگوں کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے حقوق انسانی کا منشور سن رہے ہیں۔

موجودہ شکل میں یہ ہوتا ہے کہ حج کے دوران بولے ہوئے تمام الفاظ عربی زبان میں کہے جاتے ہیں اس لیے ان کا دعوتی فائدہ صرف عربی دانوں تک محدود رہتا ہے۔ اگر اس معاملہ میں ڈبنگ کا طریقہ اختیار کیا جائے تو حج کا دعوتی فائدہ عالمی سطح تک وسیع ہو جائے گا۔

اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ سعودی حکومت جو ہر سال ٹی وی کے ذریعہ حج کی تصویر اور آوازیں نشر کرتی ہے اور اس کو لے کر تمام دنیا کے ٹی وی نظام پر اسے دکھایا جاتا ہے، وہ ڈبنگ کے ذریعہ حج کے دوران بولے جانے والے الفاظ کا ترجمہ ہر زبان میں نشر کرے۔ یعنی تصویریں تو وہی ہوں جو کہ اصلاً ہوتی ہیں مگر ہر ملک کے لوگ اس کی آوازوں کو اپنی اپنی زبان میں سن رہے ہوں۔ اگر ڈبنگ کے اصول کو اختیار کر کے ایسا کیا جائے تو ہر ملک کے لوگ مزید دل چسپی کے ساتھ حج کے مناظر کو دیکھیں گے اور ساتھ ساتھ اس کا دعوتی فائدہ بھی اٹھائیں گے۔

ضرورت ہے کہ حجۃ الوداع کا خطبہ ہر زبان میں عام کیا جائے۔ یہ خطبہ گویا حقوق انسانی کا منشور ہے جس میں نہایت جامع انداز میں اسلام کی مکمل دعوت آگئی ہے۔

درمیانی طبقہ نہیں

سچا دین وہ ہے جو انسان کو اس کے خدا سے ملائے۔ انسان پیدائشی طور پر اپنے سینہ میں اپنے خالق کی طلب لیے ہوئے ہے۔ وہ عین اپنے فطری تقاضے کے تحت یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے خالق کو پائے اور اس سے پوری طرح وابستہ ہو جائے۔ خدا کا بھیجا ہوا سچا دین اس معاملہ میں ایک روحانی رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ انسان کے اندر اس شعور کو جگاتا ہے جو کسی انسان کو خدا کے ساتھ جوڑنے والا ہے۔

مگر بعد کے زمانہ میں پچھلے مذہبوں میں بگاڑ پیدا ہوا۔ دھیرے دھیرے ایسا ہوا کہ خدا کے دین کی جگہ کچھ انسانوں نے لے لی اور اس طرح وہ مذہبی ادارہ قائم ہوا جس کو عام طور پر کلرجی کہا جاتا ہے۔ اس درمیانی طبقہ نے انسان اور خدا کے بیچ میں ایک واسطہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اِتَّخَذُوٓا اَحبَارَھُم وَرُھبَانَھُم اَربَاباً مِن دُونِ اللّٰہِ (التوبہ ۳۱)

یہ عمل تمام مذہبوں میں جاری رہا یہاں تک کہ دھیرے دھیرے یہ حال ہوا کہ آج اسلام کے سوا، ہر مذہب میں درمیانی طبقہ کا انسٹی ٹیوشن وجود میں آگیا ہے۔ ہر مذہب کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا تک پہنچنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اس درمیانی طبقہ کو واسطہ بنائیں۔ اس طبقہ کے بغیر براہ راست طور پر وہ خدا تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ درمیانی ادارہ آج ہر مذہب میں بہت بڑے پیمانہ پر وجود میں آچکا ہے۔ حتیٰ کہ ان مذہبوں کا تصور ان کے درمیانی طبقہ کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

اس معاملہ میں اسلام تمام مذاہب میں واحد استثنار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام چونکہ ایک محفوظ مذہب ہے۔ آخری دین کی حیثیت سے خدا نے اس کو براہ راست طور پر اپنی خصوصی حفاظت میں لیا ہے، یہی وجہ ہے کہ مختلف اتار چڑھاؤ پیش آنے کے باوجود اسلام اپنی اس استثنائی حیثیت کو باقی رکھے ہوئے ہے کہ دوسرے مذاہب کی طرح اس کے گرد درمیانی طبقہ کا ادارہ (انسٹی ٹیوشن) وجود میں نہ آسکا۔ اسلام کے مطابق آج بھی

ایک بندہ اپنے رب سے براہ راست طور پر مربوط ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے۔

اس اعتبار سے اسلام ایک عظیم نعمت ہے۔ وہ انسان کے لیے ایک ربانی تحفہ ہے۔ وہ انسانی روح کی اس بے چینی کا جواب ہے کہ وہ اپنے رب کو پالے اور اس کے ساتھ مربوط ہو سکے۔

خدا اور بندہ کے درمیان ایک ایسے مذہبی طبقہ کا وجود جو دونوں کے درمیان وسیلہ ہو، سراسر فطرت کے خلاف ہے، اس طرح انسان اس عظیم ترین نعمت سے محروم ہو جاتا ہے جو اس دنیا میں اس کے لیے مقدر کی گئی ہے — وہ ہے براہِ راست خدا کو پالینا۔

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو پیدائشی طور پر اپنے اندر خدا کی بے پناہ طلب رکھتی ہے۔ انسان اپنے سارے دل اور سارے وجود کے ساتھ خدا تک پہنچ جانا چاہتا ہے۔ اس کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ وہ اپنے خدا کو پاکر اس سے لپٹ جائے، وہ اس کے آگے اپنے بیتابانہ تعلق کا اظہار کرے، وہ اس کے سامنے روئے اور گڑگڑائے۔ وہ اس کے لیے آنسو بہاکر اپنے سینہ کی ویران کھیتی کو آباد کرے۔ وہ نفسیاتی طور پر یہ تجربہ کرے کہ وہ خدا کا ہو گیا ہے اور خدا اس کا۔

مگر درمیانی مذہبی طبقہ مستقل طور پر اس قسم کی خدائی یافت میں رکاوٹ ہے۔ اس درمیانی طبقہ کی مثال ایسی ہی ہے کہ جیسے آنکھ اور روشنی کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیا جائے اور روشنی کے ہوتے ہوئے بھی آنکھ اس کو نہ دیکھ سکے۔

انسان کے اندر چھپے ہوئے ربانی جذبات صرف خدا کے لیے اُبل سکتے ہیں نہ کہ اپنی جیسی کسی مخلوق کے لیے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب میں انسان اور خدا کے درمیان ربط کا معاملہ صرف کچھ ظاہری رسوم کا معاملہ ہو کر رہ گیا ہے۔ دوسرے مذاہب کے ماننے والے درمیانی وسیلہ کے نام پر، خواہ وہ زندہ وسیلہ ہو یا مُردہ وسیلہ، کچھ بے جان قسم کی ظاہری رسمیں ادا کرتے ہیں۔ اس سے آگے جو حقیقی ربانی تجربات ہیں وہ کبھی ان کو نصیب نہیں ہوتے۔

درمیان میں اٹکے ہوئے انسان کو اس کے خدا سے ملائیے تاکہ اس کے اندر چھپے ہوئے ربانی جذبات ابلیں۔ انسان براہ راست خدا سے مانگے، وہ بلاواسطہ اپنا نذرانہ اپنے رب کو پیش کر سکے۔

سائنسی تصدیق

موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے حق میں ایک نیا طاقت ور عنصر وجود میں آیا ہے جو اس سے پہلے موجود نہ تھا۔ وہ ہے — علم انسانی کا دین کی تصدیق بننا۔ مزید یہ کہ موجودہ زمانہ میں جو نئی حقیقتیں دریافت ہوئی ہیں انھوں نے بیک وقت دو کام کیے ہیں۔ ایک طرف انھوں نے اسلامی حقیقتوں کو انسان کے علمی مسلمات کی سطح پر قابل فہم بنا دیا ہے اور دوسری طرف یہ ثابت کیا ہے کہ دوسرے مذاہب کے معتقدات علمی اور سائنسی اعتبار سے قابل اعتبار نہیں۔ اس سلسلہ میں یہاں ایک تقابلی مثال درج کی جاتی ہے۔

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰ میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ کے زمانہ کا فرعون جب پانی میں غرق کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ — آج ہم تیرے بدن کو بچائیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے نشانی بنے (یونس ۹۲) فرعون موسیٰ (ریمسس ثانی) کا یہ بدن مصر کے اہرام میں موجود تھا۔ ۱۸۹۸ میں وہ مستشرقین کی مدد سے اہرام سے نکالا گیا اور اس کو قاہرہ کے میوزیم میں ایک شیشہ کے کیس میں رکھا گیا جہاں وہ اب تک موجود ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس، صفحہ ۲۴۱ — ۲۲۴)

ایک طرف قرآن کا یہ دعویٰ تھا اور دوسری طرف اس کے بالمقابل مسیحی چرچ کا ایک دعویٰ تھا۔ وہ یہ کہ اٹلی کے شہر تورین کے ایک چرچ میں حضرت مسیح کا کفن موجود ہے۔ جو دو ہزار سال پہلے ہونے والے واقعہ کی ایک نشانی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق، حضرت مسیح کو مصلوب کرنے کے بعد جب ان کا بدن سولی سے اتارا گیا تو نعوذ باللہ ان کے مردہ جسم پر کھدر جیسی ایک چادر پھیلا دی گئی۔ اس کپڑے پر حضرت مسیح کے جسم کا دھندلا عکس آگیا۔ مسیحی چرچ کے دعویٰ کے مطابق تورین کے کیتھیڈرل میں یہ کپڑا دو ہزار سال سے رکھا ہوا ہے۔

یہ دو یکساں نوعیت کے دعوے تھے۔ اور جدید سائنسی ٹکنیک کی دریافت سے پہلے یہ ممکن نہ ہو سکا تھا کہ دونوں کو جانچ کر ان کی تاریخی اعتباریت کی تصدیق یا تردید کی جائے۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کے وسط میں کاربن ڈیٹنگ کا طریقہ دریافت ہوا جس کے

ذریعہ کسی قدیم چیز کی عمر نہایت صحت کے ساتھ معلوم کی جا سکتی ہے۔

اب علما سائنس نے بڑے پیمانہ پر قدیم چیزوں کی عمر معلوم کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ انھیں میں سے مذکورہ دو چیزیں بھی تھیں۔ سب سے پہلے کچھ مستشرقین قاہرہ گئے۔ وہاں انھوں نے حکومت مصر کی خصوصی اجازت کے تحت فرعون کی مذکورہ مومیائی کی ہوئی لاش کو کاربن ڈیٹنگ کی ٹکنیک کے ذریعہ پرکھا۔ اس تجربہ کے ذریعہ معلوم ہوا کہ مذکورہ لاش کی عمر عین وہی ہے جو حضرت موسیٰ کی تھی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ وہ یقینی طور پر حضرت موسیٰ کا ہم عصر تھا۔ اس طرح کاربن ڈیٹنگ کے جدید آزمائشی اصول نے قرآن کے اس بیان کی تصدیق کر دی کہ فرعونِ موسیٰ کا بدن محفوظ ہے اور وہ بعد کے لوگوں کے لیے نشانی بنے گا۔

دوسری طرف یورپ کے کچھ علما تورین گئے۔ وہاں انھوں نے چرچ سے اس بات کی اجازت حاصل کی کہ وہ وہاں رکھے ہوئے کفنِ مسیح کا بکس کھولیں اور کاربن ڈیٹنگ کے استعمال سے اس کی عمر معلوم کریں۔ چرچ کے ذمہ داروں نے پہلے انکار کیا، پھر مشکل سے اس کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد مزعومہ کفنِ مسیح پر کاربن ڈیٹنگ کی ٹکنیک استعمال کی گئی تاکہ اس کی عمر معلوم کی جا سکے۔ اس تجربہ نے حیرت انگیز طور پر یہ ثابت کیا کہ مذکورہ کفن کی عمر صرف ۵۰۰ سال ہے۔ جبکہ کفنِ مسیح ثابت ہونے کے لیے اس کو دو ہزار سال کا ہونا چاہیے تھا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: عظمتِ اسلام، ۹۳-۹۲)

یہ ایک علامتی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدید علم کس طرح ایک طرف غیرِ اسلام کا بے اصل ہونا ثابت کر رہا ہے۔ اور دوسری طرف یہی جدید علم اسلام کی صداقت کو از سرِ نو زیادہ قوت کے ساتھ برحق ثابت کر رہا ہے۔

اس صورتِ حال نے اسلام کے داعیوں کے لیے ایک نیا طاقت ور امکان کھول دیا ہے۔ نئے حالات میں وہ نئے عزم و یقین کے ساتھ اسلامی دعوت کا کام کر سکتے ہیں اور اس کو عالمی سطح پر قابلِ قبول بنا سکتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں انسانی علم آخری حد تک دینِ حق کا مؤید بن گیا ہے۔ جدید علم حق کے داعی کا طاقت ور ترین ہتھیار ہے۔

مذہبی آزادی

قدیم مکہ میں قریش نے تمام قبائل عرب کے بت کعبہ میں رکھ دیے تھے۔ اس بنا پر ان بتوں کی اور کعبہ کی زیارت کے لیے بڑی تعداد میں دور دور کے قبائل آتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان مشرک قبائل کے خیموں میں جاتے اور انھیں توحید کی دعوت دیتے۔ اس سلسلہ میں تفصیلی واقعات سیرت کی کتابوں میں آئے ہیں۔

ایک بار آپ قبیلہ بنو شیبان بن ثعلبہ کے خیمہ میں گئے۔ ان سے آپؐ نے کہا کہ میں تم کو اس بات کی طرف بلاتا ہوں کہ تم گواہی دو کہ اللہ ہی ایک معبود ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں (ادعوکم الی شهادة ان لا الٰه الا اللہ وحده) قبیلہ کے سردار نے آپ کی دعوت کو ماننے سے انکار کیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ ہم فارس کی سرحد پر آباد ہیں اور شاہ فارس نے ہم سے یہ عہد لیا ہے کہ ہم کوئی نئی بات نہ کریں اور نہ کسی نئی بات کرنے والے کو اپنے یہاں جگہ دیں (ان لا نحدث حدثاً، ولا نؤوی محدثاً) حیاۃ الصحابہ ۱/۱۰۲-۱۰۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ کو ایک خالص غیر سیاسی عقیدہ کی طرف بلایا تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے مذکورہ جواب کیوں دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں مذہب ریاست کا ایک معاملہ سمجھا جاتا تھا۔ کسی مذہب کو ماننے یا اس کی طرف دعوت دینے کے لیے ضروری تھا کہ اس کو حکومتِ وقت کی اجازت حاصل ہو۔ حکومتِ وقت کی اجازت کے بغیر کسی غیر سرکاری مذہب کی تبلیغ کرنا غداری کے ہم معنی سمجھا جاتا تھا۔ اور ایسے آدمی کو سخت سزا دی جاتی تھی۔

اس لیے قدیم زمانہ میں ہر ملک میں مذہبی تعذیب (religious persecution) کے واقعات پائے جاتے ہیں۔ یہودیوں نے اپنے اقتدار کے زمانہ میں عیسائیوں پر سختیاں کیں۔ عیسائیوں کو اقتدار ملا تو انھوں نے یہودیوں کو اپنی زیادتی کا نشانہ بنایا۔ ہندستان میں ہندو راجاؤں نے بدھ ازم کے ماننے والوں پر سختیاں کیں۔ ان میں سے کوئی فرقہ بھی سیاسی انقلاب کا داعی نہ تھا۔ وہ صرف غیر سیاسی دائرہ میں اپنے مذہب کا پرچار کر رہا تھا۔

اس کے باوجود ہر ایک کو تعذیب کا نشانہ بننا پڑا۔

قدیم زمانہ میں تمام دنیا میں یہی حال تھا۔ مذہب کا معاملہ تمام تر بادشاہ کی مرضی پر منحصر ہوتا تھا اور بادشاہ اپنے ملک میں اپنے اختیار کردہ مذہب کے سوا کسی اور مذہب کو آزادی دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے مذہب کی دعوت و اشاعت کا کام انتہائی دشوار کام بنا ہوا تھا۔

لمبے تاریخی عمل کے بعد مذہبی تعذیب کا دور اب ختم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ مکمل مذہبی آزادی کا دور ساری دنیا میں آگیا ہے۔ فرنچ ریولیوشن کے بعد اس کے لیڈروں نے ۲۶ اگست ۱۷۸۹ء کو جو اعلان نامہ جاری کیا اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ ہر مرد اور عورت کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ وہ جس مذہب کو چاہے مانے، جس مذہب پر چاہے عمل کرے۔ مزید یہ کہ ہر ایک کو یہ حق بھی حاصل ہوگا کہ وہ پُر امن طور پر اپنے مذہب کی تبلیغ کر سکے (X/1048)

پھر اس عالمی جنگ کے بعد جب اقوام متحدہ کے نام سے تمام قوموں کی عالمی تنظیم بنی تو اس نے متفقہ طور پر یونیورسل ڈیکلریشن آف ہیومن رائٹس کے نام سے جون ۱۹۴۸ میں ایک اعلان نامہ جاری کیا۔ اس میں مزید قوت کے ساتھ یہ تسلیم کیا گیا کہ ہر مرد یا عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جس مذہب کو چاہے اختیار کرے اور جس مذہب کی چاہے تبلیغ کرے۔ اس اعلان نامہ پر دنیا کی تمام قوموں نے اپنا دستخط ثبت کیا (X/1050)

اقوام متحدہ کا یہ اعلان نامہ عالمی طور پر تمام قوموں میں مان لیا گیا۔ اور ہر ایک نے اپنے دستور میں اس کو لکھ کر اس کی باقاعدہ توثیق کر دی۔ مثلاً ہندستان میں آزادی کے بعد جو دستور وضع کیا گیا اس میں دفعہ نمبر ۲۵ شامل کی گئی۔ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ ہر ہندستانی شہری کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ (propagation) کی آزادی ہوگی۔

یہ مذہبی آزادی ایک عظیم نعمت ہے جو ہزار سالہ عمل کے بعد دنیا میں آئی ہے۔ اس نے دعوتی مواقع کو غیر محدود حد تک بڑھا دیا ہے۔

موافق حالات

اسلام کے دور اول میں مکہ میں جو تھوڑے سے لوگ رسول اللہؐ کے ہاتھ پر ایمان لائے وہ کھل کر نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔ وہ چھپ کر اور انفرادی طور پر نماز پڑھا کرتے تھے۔ جب بھی کوئی مسلمان کعبہ میں داخل ہو کر وہاں نماز پڑھنا چاہتا تو وہاں کے مشرکین اس کے خلاف شور و غل کرتے اور اس کو مارتے پیٹتے۔ یہاں تک کہ اس کے لیے سکون سے نماز ادا کرنا مشکل ہو جاتا۔

اس وقت کی دنیا میں ہر جگہ یہی صورت حال قائم تھی۔ مگر آج یہ حالت مکمل طور پر بدل چکی ہے۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۶ کو راقم الحروف کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا جس کو یہاں میں بلا تقابل درج کر رہا ہوں۔ اس دن بمبئی میں چوپاٹی کے مقام پر ایک بہت بڑا جلسہ تھا۔ اس کو سوادھیائے تحریک والوں نے منظم کیا تھا۔ چوپاٹی کے وسیع میدان میں تقریباً دس لاکھ ہندو اکٹھا تھے۔ ایک سرے پر بہت اونچا اور بہت وسیع منچ بنایا گیا تھا جس پر ہندوؤں کے بڑے بڑے مذہبی اور سیاسی لیڈر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی ایک مقرر کے طور پر وہاں مدعو تھا۔

اس دوران مغرب کی نماز کا وقت آگیا۔ میں نے اجتماع کے ناظم مہیش جی سے کہا کہ میری نماز کا وقت ہو گیا ہے اور اب مجھے نماز ادا کرنا ہے۔ انھوں نے فوراً کہا کہ آپ یہیں منچ پر اپنی نماز پڑھ لیں۔ چنانچہ میں نے منچ کے ایک طرف کھڑے ہو کر سب کے سامنے مغرب کی نماز ادا کی۔ اس وقت سوادھیائے تحریک کے چیرمین دادا جی پانڈورنگ شاستری کی تقریر ہو رہی تھی۔ لوگوں نے بتایا کہ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں یہاں نماز پڑھ رہا ہوں تو انھوں نے اپنی تقریر روکی اور میری طرف رخ کر کے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا۔

ان دونوں واقعات میں یہ فرق کیوں ہے۔ دور اول کے واقعہ میں غیر مسلموں نے ایک مسلمان کو نماز پڑھنے نہیں دیا تھا۔ آج خود غیر مسلموں کے بڑے مجمع میں ایک مسلمان آزادی کے ساتھ پُرسکون طور پر نماز ادا کرتا ہے۔ اس فرق کا سبب زمانے کی تبدیلی ہے۔ قدیم زمانہ

میں مذہبی جبر کا نظام قائم تھا۔ اور موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔ اس بنا پر آج مذہب کے حق میں ایسے امکانات کھل گئے ہیں جو کبھی پائے نہیں جاتے تھے۔

پہلے تشدد کے ماحول میں مذہب پر عمل کیا جاتا تھا۔ آج امن کے ماحول میں مذہب پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ پہلے آزادانہ طور پر مذہبی سرگرمیاں جاری نہیں کی جا سکتی تھیں، آج یہ ممکن ہو گیا ہے کہ کامل آزادی کے ساتھ مذہبی سرگرمیوں کو جاری کیا جائے۔

دعوت کے حق میں یہ موافق واقعہ بہت بڑے پیمانہ پر پیش آیا ہے۔ ہر ملک میں اس کے اثرات موجود ہیں۔ حتیٰ کہ جن ملکوں کے بارے میں یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ وہاں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے وہاں بھی آزادی کی یہ صورت حال پوری طرح موجود ہے۔

قدیم زمانہ میں فکری آزادی نہ ہونے کی وجہ سے یہ صورت حال تھی کہ آزادانہ تبادلۂ خیال نہیں ہوتا تھا۔ غالب نقطۂ نظر کے خلاف اظہار رائے ممکن نہ تھا۔ اس بنا پر یہ امکان موجود نہ تھا کہ کسی سماج میں کسی نئے نقطۂ نظر کی تبلیغ و اشاعت کی جائے۔

موجودہ زمانہ میں یہ صورتِ حال یکسر بدل گئی ہے۔ اب آزادانہ اظہار رائے کو نہایت پسند کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ اختلافی رائے کو برداشت نہ کریں وہ جدید سماج میں غیر معیاری سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ مخالفانہ رائے کو سنیں اور اس پر سنجیدگی سے اظہار خیال کریں وہ آج کے سماج میں وقت کے اعلیٰ معیار کے مطابق قرار پاتے ہیں۔

اس صورتِ حال نے دعوتِ اسلامی کے لیے ایسے نئے مواقع کھول دیے ہیں جو اس سے پہلے تاریخ میں کبھی موجود نہ تھے۔ آج یہ ممکن ہو گیا ہے کہ جس طرح سیکولر موضوعات پر تبادلۂ خیال کے لیے مجلسیں منعقد کی جاتی ہیں، اسی طرح دینی موضوعات کے لیے ہر جگہ مجلسیں منعقد ہوں جن میں کھلے طور پر اسلامی تعلیمات کا چرچا کیا جائے، اس پر سوال و جواب ہوں اور حکمت اور مجادلۂ احسن کے انداز میں اسلام کا پیغام لوگوں کے ذہن نشین کیا جائے۔

یہ ایک عظیم امکان ہے، اگر ملت کے اہل افراد اٹھیں اور اس کو حکمت کے ساتھ استعمال کریں تو بلاشبہہ اس کے غیر معمولی نتائج برآمد ہوں گے۔

دعوۃ اکسپلوزن

امریکہ کے ایک تعلیم یافتہ غیر مسلم نے ٹی وی پر اسلام کے بارے میں کچھ چیزیں دیکھیں۔ اس کے بعد اس کے اندر اسلام کے بارے میں جاننے کا شوق پیدا ہوا۔ اس نے ٹیلی فون ڈائرکٹری میں اسلام کا لفظ تلاش کیا۔ اس میں اس کو ایک ایسے ادارہ کا ٹیلی فون نمبر ملا جس کے نام کا پہلا لفظ اسلامک تھا۔ اس کے بعد اس نے اس نمبر پر رابطہ قائم کیا۔ دوسری طرف سے جب ہلو کی آواز آئی تو اس نے کہا کہ کیا وہاں کوئی شخص ہے جو مجھ کو اسلام کے بارے میں معلومات دے۔

اس طرح کے تجربات کے بعد امریکہ کے کچھ مسلمانوں کو یہ خیال آیا کہ وہ ٹیلی فون پر اسلامی معلومات دینے کا نظام قائم کریں۔ چنانچہ آج وہاں "دعوۃ ہاٹ لائن" کے نام سے کئی ٹیلیفونی خدمات قائم کی گئی ہیں جہاں ہر وقت کوئی آدمی موجود رہتا ہے جو پوچھنے والوں کو ٹیلی فون پر اسلام کے بارے میں معلومات فراہم کرے۔ اسی طرح ریڈیو، ٹی وی، انٹرنٹ اور دوسرے ذرائع ابلاغ سے اسلام کے تعارف کا نظام جگہ جگہ قائم ہو چکا ہے اور وہ کامیابی کے ساتھ عمل کر رہا ہے۔

بیسویں صدی کے وسط تک امریکہ اور یورپ کے ملکوں میں صرف چند مسجدیں موجود تھیں۔ آج ان ملکوں میں ہر شہر ہر بستی میں مسجدیں بنی ہوئی ہیں۔ اسی طرح ہزاروں کی تعداد میں مدرسے اور اسلامک سنٹر قائم ہیں۔ جگہ جگہ اسلامی جلسے ہو رہے ہیں۔ کثیر تعداد میں اسلامی کتابیں چھاپ کر پھیلائی جا رہی ہیں۔ حتیٰ کہ غیر مسلموں کے پبلشنگ ادارے بھی بہت بڑی تعداد میں اسلامی کتابیں چھاپ کر وسیع پیمانہ پر ان کو عالمی بازار میں پہنچا رہے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

یہ دعوۃ اکسپلوزن ہے۔ موجودہ زمانہ میں مختلف اسباب سے دنیا بھر میں نئی اسلامی سرگرمیاں وجود میں آئی ہیں۔ لوگ عام طور پر اسلام کے بارہ میں واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح اپنے آپ ایسی سرگرمیاں جاری ہو گئی ہیں جو براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اسلام کے تعارف کا ذریعہ ہیں۔ ان کا پھیلاؤ اتنا زیادہ بڑھا ہوا ہے کہ ان کو دعوۃ اکسپلوزن کہنا عین درست ہوگا۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے زمانہ میں ایک ایسا وقت آئے گا جبکہ اللہ تعالیٰ اسلام کے کلمہ کو ساری دنیا میں ہر چھوٹے اور بڑے گھر میں پہنچا دے۔ یہ ایک پیشین گوئی ہے اور مذکورہ صورتِ حال اس پیشین گوئی کی تصدیق۔

دعوۃ اکسپلوزن کی اس صورت حال کو ایک تاریخی عمل (historical process) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ تاریخی عمل خود قانون قدرت کے تحت شروع ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ اس کا دین دنیا میں بسنے والے تمام انسانوں تک پہنچ جائے۔ اس کے لیے اس نے ایک طرف جدید ذرائع ابلاغ کو وجود دیا جس کے ذریعہ اسلام کی عالمی پیغام رسانی ممکن ہو سکی۔ دوسری طرف اس نے کمالِ حکمت سے اسلام میں تجارتی قدر (commercial value) پیدا کر دی۔ اسی کے ساتھ جدید علمی تبدیلیوں کے ذریعہ یہ ذوق پیدا کیا کہ لوگ عام طور پر مذہب اور اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے شائق ہو گئے۔ مزید یہ کہ موجودہ زمانہ میں ایسے اسباب فراہم ہوئے کہ مسلمان اپنے ملکوں سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل گئے۔ انھوں نے ہر جگہ اسلامی ادارے قائم کیے، وغیرہ۔

یہ تمام چیزیں کسی پیشگی منصوبہ کے بغیر ظہور میں آئیں۔ ان کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اللہ نے اپنی قدرت سے اسلامی دعوت کو خود تاریخی عمل میں شامل کر دیا۔ انسانی تاریخ کے سفر کے ساتھ اسلامی دعوت بھی تیزی کے ساتھ سفر کرنے لگی۔ یہ عمل ایک ایسا ہمہ گیر عمل ہے کہ نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی اس کو انجام دینے میں شریک ہیں۔

ان حالات میں یہ کہنا صحیح ہو گا کہ موجودہ زمانہ میں داعی اور غیر داعی دونوں دعوت کے عمل میں یکساں طور پر شریک ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ داعی اس عمل کا شعوری حصہ ہے اور غیر داعی اس عمل کا غیر شعوری حصہ۔

موجودہ زمانہ میں اس دعوۃ اکسپلوزن نے اسلام کے داعی کے کام کو بے حد آسان بنا دیا ہے۔ پہلے زمانہ کے داعی کو اگر ہوا کے رخ کے خلاف چل کر اپنا دعوتی سفر طے کرنا پڑتا تھا تو اب آج کے داعی کے لیے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ وہ ہوا کے رخ پر سفر کرتے ہوئے اپنا دعوتی کام انجام دے سکے۔

روح عصر

موجودہ زمانہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک نیا زمانہ ہے۔ یہ ایک ایسا زمانہ ہے جب کہ انسانیت روایتی دور سے نکل کر سائنسی دور میں داخل ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں انسانی فکر میں زبردست انقلاب آیا ہے۔ جدید تبدیلیوں کے نتیجہ میں ایک نیا انسان ظہور میں آیا جو پچھلے زمانہ کے انسان سے بہت مختلف تھا۔ اس نئے انسان کا ذہن اور مزاج حیرت انگیز طور پر اسلامی دعوت کے عین موافق ہے۔ اس جدید ذہن کی خصوصیات مختصر طور پر یہ ہیں :

۱۔ جدید ذہن کی سب سے اہم خصوصیت وہ ہے جس کو روح تجسس (spirit of enquiry) کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ کے انسان میں تجسس کی روح بہت محدود پیمانہ پر پائی جاتی تھی۔ اُس وقت کا انسان یہ نہیں جانتا تھا کہ علم کی دنیا لامحدود حد تک وسیع ہے۔ اس لیے اس کا علمی شوق بھی بہت زیادہ وسیع نہ تھا۔ مگر موجودہ زمانہ کی تحقیقات نے بتایا کہ علم کی دنیا لامحدود حد تک وسیع ہے۔ اس لیے انسان کے اندر تجسس کا جذبہ بھی لامحدود حد تک پیدا ہو گیا۔

یہ روح تجسس انسان کے اندر اولاً مادی علوم کی نسبت سے بیدار ہوئی۔ مگر بڑھتے بڑھتے وہ علم کے تمام دائروں میں جا پہنچی۔ اس کا ایک خصوصی پہلو مذہب کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کا شوق ہے۔ اس طرح جدید انسان کی روح تجسس نے اس کو اسلامی دعوت کا بہترین مخاطب بنا دیا ہے۔

۲۔ جدید ذہن کی دوسری نمایاں صفت موضوعیت (objectivity) ہے۔ یعنی کسی بھی قسم کے تعصب کے بغیر چیزوں کو ویسا ہی دیکھنا جیسا کہ وہ ہیں۔ یہ صفت جدید انسان کے اندر سائنس کے اثر سے پیدا ہوئی۔ طبیعی سائنس کے مطالعہ میں آدمی کو آخری حد تک بے آمیز ذہن سے مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر طبیعی سائنس میں کسی مطلوب نتیجہ تک پہنچنا ممکن نہیں۔ ایک شاعر اپنے تخیل کی دنیا میں ستارے کو چھوٹا اور چاند کو بڑا بتا کر یہ کہہ سکتا ہے کہ :

فروغِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں   کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

مگر سائنس داں اس قسم کے غیر واقعی بیان کا تحمل نہیں کرسکتا۔ اس کو صرف مطابقِ واقعہ بات کہنا ہے۔ غیر مطابقِ واقعہ بات کہتے ہی اس کے علم کی پوری عمارت ڈھ جائے گی۔

اس طرح سائنسی مطالعہ نے جدید انسان کو کامل طور پر حقیقت پسند بنا دیا۔ اس کے اندر یہ نگاہ پیدا کی کہ وہ چیزوں کو کسی کمی بیشی کے بغیر دیکھ سکے۔ وہ کسی چیز کے بارے میں عین مطابق واقعہ رائے قائم کرے۔

جدید انسان کی یہ صفت بھی اسلامی دعوت کے عین موافق ہے۔ اس نے جدید انسان کی ذہنی تشکیل اس طرح کی ہے کہ اسلام جب اس کے سامنے لایا جائے تو وہ پوری طرح غیر جانب دارانہ انداز میں اس کو دیکھے اور کسی بھی قسم کے تعصب کے بغیر اس کے بارے میں بے لاگ رائے قائم کرسکے۔

۳۔ جدید انسان کی تیسری صفت اعتراف ہے۔ جدید انسان عین اپنے مزاج کے تحت بے اعترافی کا تحمل نہیں کرسکتا۔ اشیاء کے سائنسی مطالعہ میں حقیقتِ واقعہ کے اعتراف کی بے حد اہمیت ہے۔ کوئی آدمی اگر حقیقتِ واقعہ کے اعتراف میں کوتاہی کرے تو اس کا سارا معاملہ بے کار ہو کر رہ جائے گا۔

جدید انسان کی یہ صفت بھی اسلامی دعوت کے لیے نہایت کارآمد ہے۔ اس نے آج کے ایک تعلیم یافتہ انسان کو ایسا بنا دیا ہے کہ اگر اسلام کی صداقت اس پر دلائل سے واضح کردی جائے تو اپنی ذہنی ساخت کے تحت اس کے لیے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ اس کو نہ مانے۔ کسی بات کا ثابت ہو جانا ہی اس کے لیے کافی ہے کہ جدید ذہن اس کو قبول کرلے۔

ایک مسنون دعا یہ ہے کہ، اے اللہ ہمیں حق کو حق کی صورت میں دکھا اور اس کی پیروی کی توفیق دے۔ اور باطل کو باطل کے روپ میں دکھا اور اس سے بچنے کی توفیق دے۔

جدید ذہن یہ ہے کہ وہ چیزوں کو ان کے اصل روپ میں دیکھے۔ اور ایسے لوگ دعوت کے بہترین مخاطب ہیں۔ وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ سچائی کو فوراً پہچانیں اور بلا تاخیر اس کو قبول کرلیں۔

دَورِ مکالمہ

موجودہ دور کو دورِ مکالمہ (Age of Dialogue) کہا جاتا ہے۔ یعنی اختلافی موضوع پر سنجیدہ انداز میں تبادلۂ خیال کرنا۔ یہ ایک نئی چیز ہے جو موجودہ زمانہ میں پیدا ہوئی ہے۔ اس سے پہلے اختلاف رائے کا فیصلہ میدانِ جنگ میں کیا جاتا تھا۔ اب جنگ حتیٰ کہ مناظرہ تک ایک معیوب چیز بن چکی ہے۔ اب اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لیے صرف ایک ہی طریقہ کو باوقار طریقہ سمجھا جاتا ہے اور وہ میز پر ہونے والا سنجیدہ مکالمہ ہے۔

یہ جدید مزاج دو عالمی جنگوں کے بعد اور بھیانک ہتھیاروں کے انجام کو دیکھ کر پیدا ہوا ہے۔ اس جدید ذہن نے اسلامی دعوت کے لیے نئے اور موثر امکانات کھول دیے ہیں۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ غیر مذہب کے لوگوں کے سامنے اسلام کی دعوت اس طرح پیش کی جائے کہ نہ مناظرہ بازی ہو اور نہ ان سے ٹکراؤ کی نوبت آئے۔ بلکہ سنجیدہ تبادلۂ خیال کے انداز میں اسلام کے پیغام کو دوسروں تک پہنچایا جا سکے۔

میں خود اس قسم کے کئی ڈائیلاگ میں شریک ہوا ہوں —— مسلم۔ہندو ڈائیلاگ، مسلم۔مسیحی ڈائیلاگ، مسلم۔یہودی ڈائیلاگ، وغیرہ۔ میں نے پایا ہے کہ ان مکالمات میں اسلام کی دعوت دوسرے مذہب سے تعلق رکھنے والوں کے سامنے پیش کی گئی مگر نہ کوئی اشتعال ہوا، نہ مناظرہ پیش آیا اور نہ کسی قسم کے ٹکراؤ کی نوبت آئی۔ جب کہ قدیم زمانہ میں ایسا ہونا سخت مشکل تھا۔

مثلاً مسلم۔ہندو ڈائیلاگ میں وحدت وجود کے نظریہ کے مقابلہ میں توحید کا تصور واضح طور پر پیش کیا گیا۔ مسلم۔مسیحی ڈائیلاگ میں اسلام کے عقیدۂ آخرت اور مسیحیت کے عقیدۂ کفارہ کا کھلا تقابل کیا گیا۔ اسی طرح مسلم۔یہودی ڈائیلاگ میں قرآن اور بائبل کا تقابل اس پہلو سے کیا گیا کہ دونوں میں سے کون تاریخی اعتبار سے زیادہ مستند ہے۔ مگر ان مکالموں میں کسی بھی قسم کے اشتعال کی نوبت نہیں آئی۔ ساری گفتگو سنجیدگی اور افہام و تفہیم کے انداز میں ہوئی۔

یہ مکالماتی مزاج تمام تر ایک نیا مزاج ہے جو پہلے کبھی موجود نہ تھا۔ اس نئے مزاج نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ اسلامی دعوت کے کام کو عین اس علمی اسلوب میں کیا جائے جو عمومی طور پر مسلّم ہے اور وسیع پیمانہ پر دوسرے موضوعات میں کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار یہ امکان پیدا ہوا ہے کہ انسان کے خود اپنے مانوس اسلوب میں اسلامی دعوت کا عمل جاری کیا جا سکے۔ لوگوں کے اپنے تسلیم کیے ہوئے ڈھانچہ میں انھیں اسلام کا مخاطب بنایا جائے۔

دعوتی مکالمہ کا یہ کام بہت بڑے پیمانہ پر اور ہر جگہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ مکالمہ نہ صرف اسلام کا تعارف ہے بلکہ وہ اسلام اور دوسرے مذاہب کا گویا اجتماعی انداز میں تقابلی مطالعہ بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ڈائیلاگ کے طریقہ کو سنجیدہ انداز میں علمی اسلوب میں کیا جائے تو وہ اسلام کے تعارف عام کا موثر ذریعہ بن سکتا ہے۔

ڈائیلاگ کے طریقہ کو اسلامی دعوت کے لیے استعمال کرنے کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ عمومی طور پر ایک مسلّم طریقہ ہے۔ لوگوں کے درمیان خود ان کی اپنی روایت کے مطابق ان کے یہاں یہ طریقہ رائج ہو چکا ہے کہ اختلافی موضوعات پر ڈائیلاگ کیا جائے۔ چنانچہ مختلف رائے رکھنے والے لوگ ایک میز پر اکٹھا ہو کر عین اس طرح بات کرتے ہیں جس طرح کسی غیر اخلاقی موضوع پر بات کی جاتی ہے۔ اس طریقہ کو کسی بھی درجہ میں برا نہیں سمجھا جاتا۔ اور نہ اس کے لیے مضامین کی کوئی حد بندی ہے۔ کسی بھی موضوع پر سنجیدہ تبادلۂ خیال کے لیے اس طریقہ کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اہلِ اسلام اور دوسرے مذہب کے نمائندوں کے درمیان اس طرح کے ڈائیلاگ میں تعلیمات و احکام پر گفتگو کے علاوہ ایک آئٹم یہ رکھا جا سکتا ہے کہ ڈائیلاگ کے شروع یا آخر میں مختلف مذاہب کی مقدس کتابوں کا کچھ حصہ پڑھ کر سنایا جائے۔ اس آئٹم کو میں نے بہت موثر پایا ہے۔ اس طرح صوتی تقابل ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہو جاتا ہے کہ قرآن امتیازی اور استثنائی طور پر ایک ایسی کتاب ہے جس کا متن اپنی اصل صورت میں آج تک محفوظ ہے۔

مواصلاتی انقلاب

قدیم زمانہ میں ایک انسان اپنی آواز کو صرف اپنے قریبی ماحول تک پہنچا سکتا تھا، آج گلوبل ویلج کا زمانہ ہے۔ مواصلات اور کمیونی کیشن کے جدید ذرائع نے اس بات کو ممکن بنادیا ہے کہ آدمی ایک مقام پر رہ کر پورے ملک میں بلکہ ساری دنیا میں انتہائی سرعت کے ساتھ اپنی بات پہنچا دے۔ آج انسان کے لیے تیز رفتار سفر بھی ممکن ہوگیا ہے اور تیز رفتاری کے ساتھ اپنے پیام کی اشاعت بھی۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز جو دورِ جدید میں ظہور میں آئی وہ چھپائی کا طریقہ ہے۔ قدیم زمانہ میں ہر کتاب کو ہاتھ سے لکھنا پڑتا تھا۔ اب پرنٹنگ پریس کی ایجاد کے نتیجہ میں یہ ممکن ہوگیا ہے کہ ایک کتاب کو تیار کرکے اس کے کروروں نسخے چھپوا لیے جائیں اور پھر ساری دنیا میں انھیں پھیلا دیا جائے۔

چھپائی کا یہ طریقہ اسلامی دعوت کے لیے ایک عظیم نعمت ہے۔ کتاب کے ذریعہ ایک داعی بیک وقت بہت سے مقامات پر موجود ہوسکتا ہے اور بیک وقت بہت سے لوگوں کو اپنی دعوت کا مخاطب بنا سکتا ہے۔ کتابوں کے علاوہ اخباروں اور رسالوں کا طریقہ ہے جو اس سلسلہ میں نہایت کارآمد ہوسکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ داعی خود اپنا کوئی پرچہ نکالے اور اس میں تعارفی مضامین شائع کرے۔ وہ اس مقصد کے لیے دوسروں کے جاری کیے ہوئے اخبارات اور میگزین کو استعمال کرسکتا ہے۔ میں اپنے تجربہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر سائنٹفک انداز میں اسلامی تعلیمات پر مضامین تیار کیے جائیں تو اکثر پرچے اس کو اپنے صفحات میں چھاپنے کے لیے تیار ہوجائیں گے۔

موجودہ زمانہ میں پریس کے ذریعہ کو استعمال کرکے بڑے بڑے انقلاب لائے گئے ہیں۔ ان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ہر انقلاب کے آغاز میں پریس کی طاقت کام کرتی ہوئی دکھائی دے گی۔ اخبار اور رسالے اور کتابوں کے ذریعہ بڑے پیمانہ پر عوام کے ذہن کو بدل دیا گیا، اور جب ذہن کو بدل دیا جائے تو اس کے بعد عملی انقلاب برپا ہونا اپنے آپ ممکن ہوجاتا ہے۔

اسی طرح آڈیو اور ویڈیو کیسٹ نہایت قیمتی دعوتی ذریعے ہیں جو موجودہ زمانہ میں حاصل ہوئے ہیں۔ یہاں بھی واقعات بتاتے ہیں کہ کئی بڑے بڑے انقلابات آڈیو کیسٹ اور ویڈیو کیسٹ ہی کے ذریعہ ظہور میں آئے۔

پہلے زمانہ میں آدمی تقریر کرتا تھا تو صرف قریب کے لوگ اس کو سن سکتے تھے۔ آج آڈیو کیسٹ کے ذریعہ وہ ساری دنیا میں اور دنیا کے ہر حصہ میں مقرر بن کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ ہر جگہ اس کی آواز اسی طرح پہنچے گی جس طرح پہلے زمانہ میں قریبی لوگوں تک پہنچتی تھی۔

ویڈیو کیسٹ کے طریقہ نے اس ذریعہ کو اور زیادہ موثر کر دیا ہے۔ ویڈیو کی صورت میں یہ ممکن ہو گیا ہے کہ نہ صرف داعی کی آواز دور دور تک سنائی دے بلکہ اس کا وجود بھی ہر مقام کے لوگوں کو اسی طرح زندہ اور متحرک حالت میں دکھائی دے جیسا کہ وہ پاس کے لوگوں کو دکھائی دیتا ہے۔ ویڈیو کیسٹ کے اس طریقہ نے تاریخ میں پہلی بار یہ امکان پیدا کیا ہے کہ داعی کی شخصیت اور اس کی آواز کو محفوظ کر کے ساری دنیا میں پھیلا دیا جائے۔ حتی کہ اپنی موت کے بعد بھی وہ لوگوں کے سامنے اسی طرح بولتا ہوا اور پیغام دیتا ہوا نظر آئے جس طرح وہ اپنی زندگی میں لوگوں کو نظر آتا تھا۔

اسی طرح ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا طریقہ بھی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا طریقہ مزید اضافہ کے ساتھ وہ فائدے اپنے اندر رکھتا ہے جو آڈیو ٹیپ اور ویڈیو ٹیپ میں پائی جاتی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں بہت سے مشن ریڈیو اور ٹی وی کو موثر طور پر اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اسلام کے داعی بھی اس کو اپنے دعوتی مشن کو پھیلانے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

بعض ملکوں میں ریڈیو اور ٹی وی کو اسلامی تعلیمات کی اشاعت کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس میں مزید بہت زیادہ اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

جدید مواصلاتی ذرائع کیسے وجود میں آئے۔ یہ فطرت میں چھپے ہوئے امکانات تھے جن کو انسان نے دریافت کیا۔ یہ حقیقۃً کسی انسان کی ایجاد نہیں بلکہ فطرت میں چھپے ہوئے رازوں کی دریافت ہے۔ یہ ذرائع خالق کائنات کا تحفہ ہیں، ان کا یہ حق ہے کہ ان کو خالق کائنات کے پیغام رسانی کے لیے استعمال کیا جائے۔

عالمی میل ملاپ

موجودہ زمانہ میں دو ایسی چیزیں انسان کو حاصل ہوئی ہیں جو اس سے پہلے کبھی دنیا میں موجود نہ تھیں —— تیز رفتار سفر، اور تیز رفتار پیغام رسانی۔ ان چیزوں نے انسان کے لیے عالمی نقل و حرکت کو ممکن بنا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور چیز وجود میں آئی ہے جس کو صنعتی انقلاب کہتے ہیں۔ صنعتی انقلاب نے انسان کے لیے معاشی امکانات کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ ان جدید حالات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لوگ بہت زیادہ سفر کرنے لگے ہیں۔ سیاحت، تجارت، ملازمت اور دوسرے مقاصد کے تحت لوگ کثرت سے سفر کر رہے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا کے ہر حصہ میں مسلمان بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اس طرح جو مسلمان مختلف ملکوں میں جا کر آباد ہو گئے ہیں یا آتے جاتے رہتے ہیں ان کا ملنا جلنا برابر غیر مسلموں سے ہوتا رہتا ہے۔ عالمی اختلاط کے اس عمل کے دوران اسلام کے تعارف کا کام بھی اپنے آپ جاری رہتا ہے، کبھی بالواسطہ انداز میں اور کبھی براہ راست انداز میں۔

اختلاط بذاتِ خود ہی دعوت کا ذریعہ ہے۔ مسلمان جب نارمل حالات میں غیر مسلموں سے ملتے جلتے ہیں تو مختلف اسباب سے بار بار اسلام زیرِ بحث آ جاتا ہے۔ اس طرح مسلم اور غیر مسلم کا اختلاط اپنے آپ اسلام کے تعارف کا سبب بنتا رہتا ہے۔

کچھ مسلمان نیویارک کے ایرپورٹ پر اترے۔ یہ نماز کا وقت تھا۔ انھوں نے ایرپورٹ پر چادر بچھا کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔ ایک امریکی نوجوان کے لیے یہ ایک نیا منظر تھا۔ وہ ان کے پاس کھڑا ہو کر ان کی حرکات و سکنات کو دیکھنے لگا۔ جب وہ لوگ نماز سے فارغ ہوئے تو اس نے پوچھا کیا تم لوگ انگریزی جانتے ہو۔ پھر اس نے پوچھا کہ یہ تم لوگ کیا کر رہے تھے۔ مسلمانوں نے اس کو اپنے پاس بٹھا لیا اور نماز کی تفصیلات بتائیں۔ وہ بہت متاثر ہوا اور اسی وقت کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

ایک مسلمان اپنے ایک امریکی دوست کو ایک میٹنگ میں لے گیا، وہاں قرآن کی تلاوت ہو رہی تھی۔ یہ ایک عرب قاری کی تلاوت تھی۔ امریکی نوجوان بہت غور سے تلاوت کو سنتا رہا۔ آخر میں اس نے کہا کہ ایسی پُرکشش آواز میں نے آج تک کبھی نہیں سنی تھی۔ اس نے پوچھا کہ یہ کیا چیز تھی۔ اس کو بتایا گیا کہ یہ قرآن کا ایک حصہ تھا جس کو ٹیپ کی مدد سے سنایا گیا۔ یہ تلاوت گویا اس امریکی نوجوان کے دل میں اسلام کا پہلا بیج تھا۔ اس کے بعد اس کے اندر مزید تجسس پیدا ہوا۔ اس نے قرآن کا انگریزی ترجمہ اور انگریزی میں دوسری اسلامی کتابوں کو حاصل کر کے ان کو پڑھا اور آخر میں اسلام قبول کر لیا۔

اختلاط کے ذریعہ تبلیغ کا کام پچھلے ہزار سال سے برابر جاری تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں کمیونی کیشن کے پھیلاؤ سے یہ اختلاط بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اور اختلاط بڑھنے کے نتیجہ میں اسلام کے تعارف کے امکانات بھی بہت زیادہ بڑھ گئے۔

اس اختلاط کے فوائد سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں۔ ہر جگہ مختلف صورتوں میں اسلام کا تعارف ہو رہا ہے۔ اس تعارف کے دوران جگہ جگہ لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ جب کسی بہانے کوئی آدمی اسلام کے کسی پہلو سے متعارف ہوتا ہے تو اس کے اندر اسلام کو مزید جاننے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ملاقات اور مطالعہ کے ذریعہ اپنی اسلامی معلومات کو بڑھاتا ہے۔ پھر انھیں میں سے ایسے لوگ نکلتے ہیں جو اسلام کو اپنا دین بنا لیتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں اختلاط کی کثرت کے باوجود اسلام کے تعارف کا کام عملاً بہت کم ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں دعوت کا شعور موجود نہیں۔ دعوتی شعور نہ ہونے کی وجہ سے فی الحال جو کام ہو رہا ہے وہ زیادہ تر بالواسطہ انداز میں ہو رہا ہے۔

مسلم اور غیر مسلم کا اختلاط ہر حال میں دعوت کا ذریعہ ہے، عام حالات میں یہ عمل بالواسطہ طور پر ہوتا ہے۔ لیکن اگر اہل اسلام کے اندر دعوتی شعور زندہ ہو تو یہ عمل براہ راست طور پر ہونے لگے گا۔ اور پھر اس کی وسعت غیر معمولی حد تک بڑھ جائے گی۔

طریق استدلال

۱۹۶۵ کا واقعہ ہے۔ اس وقت میں لکھنؤ میں تھا۔ وہاں میری ملاقات ڈاکٹر سمیع اللہ خاں سے ہوئی۔ انھوں نے فلسفہ میں ایم اے کیا تھا اور پھر برٹرینڈرسل پر ریسرچ کیا تھا۔ اس کے بعد وہ مکمل طور پر ملحد ہو گئے تھے۔ وہ اگرچہ ملحد تھے لیکن نہایت سنجیدہ اور علمی ذوق والے آدمی تھے۔

ایک بار ان سے خدا کے وجود پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اس دوران انھوں نے کہا کہ خدا کو ثابت کرنے کے لیے آپ کے پاس کرائٹیرین کیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ —— وہی کرائٹیرین جو آپ کے پاس کوئی چیز ثابت کرنے کے لیے ہو۔ میرا یہ جواب سن کر وہ خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے اس مسئلہ پر مجھ سے کوئی بحث نہیں کی۔

اس گفتگو کے پس منظر میں دراصل وہ علمی انقلاب تھا جو موجودہ زمانہ میں پیش آیا ہے۔ جس نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ خدا کے وجود کو بھی عین اسی معیارِ استدلال پر ثابت کیا جا سکے جس معیار پر دوسری علمی حقیقتوں کو ثابت کیا جاتا ہے۔

علمی تحقیقات کے دو دور ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر تک جبکہ انسان کا مطالعہ عالم کبیر (macro-world) تک محدود تھا۔ بیسویں صدی میں ایٹم کے ٹوٹنے کے بعد ایک نیا دور آیا ہے جب کہ انسان کا مطالعہ عالم صغیر (micro-world) تک جا پہنچا ہے۔

قدیم دور میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ حقیقت وہی ہے جو براہ راست انسانی مشاہدہ میں آتی ہو۔ چنانچہ اُس زمانہ میں ہر ایسے عقیدہ کو بے اصل سمجھا جاتا تھا جس کو مشاہداتی استدلال یا براہ راست استدلال کے ذریعہ ثابت نہ کیا جا سکتا ہو۔

لیکن عالم صغیر کے انکشاف کے بعد سارا معاملہ بدل گیا۔ یہ عالم صغیر جو بیسویں صدی میں دریافت ہوا وہ انتہائی حقیقی ہونے کے باوجود ناقابل مشاہدہ تھا۔ اس کے اوپر صرف استنباطی استدلال یا بالواسطہ استدلال ہی قائم کیا جا سکتا تھا۔

انسانی علم کی اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود منطق یا طریق استدلال میں تبدیلی واقع

ہوگئی۔ پہلے یہ مانا جاتا تھا کہ حقیقت وہی ہے جس پر براہ راست استدلال قائم کیا جاسکتا ہو۔ اب یہ تسلیم کرلیا گیا کہ بالواسطہ استدلال یا استنباطی استدلال بھی علمی اعتبار سے درست ہے۔ بالواسطہ استدلال بھی علمی اعتبار سے اتنا ہی معقول (valid) ہے جتنا کہ براہ راست استدلال۔

اس استدلالی تبدیلی کے بعد غیبی خدا کے وجود کو ثابت کرنا اتنا ہی ممکن ہوگیا ہے جتنا کہ بظاہر مشاہداتی چیزوں کے وجود کو ثابت کرنا۔ خالص علمی اعتبار سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

علم انسانی کے اس نئے دور نے اسلامی دعوت کے کام کو ایک نئی قوت عطا کی ہے۔ اس تبدیلی نے عقیدہ اور سائنس کے فرق کو مٹا دیا ہے۔ اب عقیدہ بھی علمی اعتبار سے اتنا ہی محکم ہے جتنا کہ سائنس کا کوئی مسئلہ۔ دونوں کے درمیان نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔

یہ صورت حال داعی کے لیے ایک علمی نعمت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے دور جدید میں دعوت کے نئے تسخیری امکانات کھول دیے ہیں۔ آج یہ ممکن ہوگیا ہے کہ دینی عقائد کو اسی اعلیٰ سائنٹفک طاقت سے مدلل کرکے پیش کیا جائے جس سے پہلے صرف سائنسی مسائل پیش کیے جاتے تھے۔

استدلال کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ مخاطب کے عقلی مسلمہ کے مطابق ہو۔ اس سے پہلے یہ مسئلہ تھا کہ مخاطب تو براہ راست استدلال میں یقین کرتا تھا اور اسلام کا داعی اپنے عقائد کو پیش کرنے کے لیے صرف بالواسطہ استدلال پر انحصار کر رہا تھا۔ مگر اب یہ فرق علمی اعتبار سے ختم ہوچکا ہے۔ آج کے مخاطب نے جدید دریافت شدہ حقائق کی بنیاد پر یہ مان لیا ہے کہ بالواسطہ استدلال کے ذریعہ ثابت ہونے والی چیز بھی اتنا ہی حقیقی ہے جتنا کہ براہ راست استدلال سے ثابت ہونے والی چیز —— یہ اسلام کے داعی کے لیے ایک عظیم نعمت ہے۔ اس علمی ترقی کے بعد یہ ممکن ہوگیا ہے کہ اسلام کی دعوت کو اسی معیارِ استدلال پر ثابت شدہ بنا دیا جائے جس کے بعد مخاطب کو مانے بغیر چارہ نہ رہے۔

نیا امکان

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ: إن الله ليؤيد هذا الدين بالرجل الفاجر (اللہ اس دین کی تائید فاجر آدمی سے بھی کرے گا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خبر کا تعلق دعوت سے بھی ہے۔ اسلام کی دعوت ایک ایسا عمل ہے، جس کو نہ صرف مخلص مسلمان انجام دیں گے، بلکہ اس عمل میں وہ لوگ بھی شریک ہوں گے جن کو اعتقادی اعتبار سے اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کی ایک مثال موجودہ زمانے میں یہ ہے کہ مختلف اسباب کے تحت اسلام میں اقتصادی قدر (commercial value) پیدا ہوگئی ہے۔ چنانچہ آج بہت بڑے پیمانہ پر سیکولر اور غیر مسلم طبقہ اسلام کے دعوتی عمل میں شریک ہوگیا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے پبلشنگ ادارے بہت بڑے پیمانہ پر قرآن و حدیث اور دوسرے اسلامی لٹریچر مختلف زبانوں میں بڑی تعداد میں چھاپ رہے ہیں اور ان کو ساری دنیا میں لوگوں تک پہنچا رہے ہیں مثال کے طور پر پنگوین، میکملن، آکسفورڈ اور کیمبرج وغیرہ جو عالمی حیثیت کے پبلشنگ ادارے ہیں اور جن کی مارکٹنگ کا جال ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ وہ اسلامی کتابیں بین اقوامی زبانوں میں چھاپ کر تمام ملکوں میں پہنچا رہے ہیں۔

انھیں میں سے ایک امکان وہ ہے جو میڈیا کی سطح پر پیدا ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ میں میڈیا، خاص طور پر پرنٹ میڈیا اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کثرت سے رپورٹیں منظر عام پر لا رہا ہے۔ یہ رپورٹیں اکثر مخالفانہ لہجہ میں ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میڈیا کو اسلام سے یا مسلمانوں سے کوئی دشمنی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں میڈیا صرف ایک انڈسٹری ہے۔ اور میڈیا کو بطور انڈسٹری چلانے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں تیز و تند اور سنسنی خیز رپورٹیں شائع کی جائیں۔ چنانچہ نہ صرف اسلام بلکہ زندگی کے ہر معاملہ میں وہ اپنے اسی اصول پر عمل کر رہے ہیں وہ soft news کو نظر انداز کر کے hot news کو نمایاں کرتے ہیں۔

تاہم اس صورتِ حال نے اسلامی دعوت کے لیے ایک نیا اور انوکھا امکان پیدا کر دیا ہے۔ قدیم زمانہ میں جب کوئی عبد اللہ ابن ابی یا کعب بن اشرف اسلام کے خلاف بولتا تھا تو مسلمان اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ خود عبد اللہ ابن ابی اور کعب ابن اشرف ہی کی زبان سے اسلام کی صحیح تصویر کا اعلان کرا سکیں۔ مگر آج استثنائی طور پر یہ ممکن ہو گیا ہے کہ جس اخبار یا میگزین نے اسلام کے خلاف کوئی مضمون چھاپا ہے خود اسی کے صفحات پر اسلام کے موافق مضمون چھاپا جا سکے اور اسلام کی صحیح تصویر لوگوں کے سامنے لائی جا سکے۔

یہ امکان اس لیے پیدا ہوا ہے کہ آج کا انسان قدیم انسان سے بہت مختلف ہے۔ آج اظہار رائے کی آزادی کو حد درجہ اہمیت دی جاتی ہے۔ لوگ غیر متعصبانہ طور پر معلومات میں اضافہ کے شائق ہو گئے ہیں۔ اس نئے مزاج کی بنا پر اب ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی اخبار یا میگزین میں اسلام کے خلاف کوئی بات چھپتی ہے تو لوگ یہ چاہنے لگتے ہیں کہ وہ اس موضوع پر مزید معلومات حاصل کریں۔ اس موضوع پر جو دوسرا نقطۂ نظر ممکن ہے اس کو اچھی طرح جانیں۔

یہ امکان آج کی دنیا میں وسیع پیمانہ پر پیدا ہوا ہے۔ اسلام کے داعیوں کو تاریخ میں پہلی بار یہ موقع ملا ہے کہ وہ دوسروں کی "زبان" سے اپنی بات کہلائیں۔ وہ دوسروں کے قائم کردہ میڈیا سے اپنے افکار کی اشاعت کریں۔ وہ اغیار کے وسائلِ ابلاغ کو اسلامی دعوت کا ذریعہ بنا لیں۔

مذکورہ حدیث کے مطابق، پہلے زمانہ میں بھی عام انسان مختلف پہلوؤں سے اسلام کی تائید کا سبب بنا۔ موجودہ زمانہ میں یہ امکان بہت زیادہ اضافہ کے ساتھ اسلام کی دعوت کو حاصل ہو گیا ہے۔ اگر اس امکان کو منظم طور پر استعمال کیا جائے تو دنیا کی ہر زبان میں اچانک اسلام کی تبلیغ ہونے لگے۔ خود اپنا عملی نظام بنائے بغیر دوسروں کا قائم کردہ عملی نظام اسلام کی اشاعت کا موثر ذریعہ بن جائے۔

اس امکان کو موثر طور پر استعمال کرنے کی شرط صرف یہ ہے کہ اسلام کی حمایت میں جو کچھ لکھا جائے وہ مکمل طور پر غیر مناظرانہ ہو، وہ علمی اسلوب میں ہو نہ کہ الزامی اسلوب میں۔

تعلیمی ادارے

موجودہ زمانہ میں ساری دنیا میں بہت بڑے پیمانہ پر تعلیمی ادارے قائم کیے گئے ہیں۔ اور تقریباً پوری انسانی نسل ان اداروں میں تعلیم پا رہی ہے۔ ان اداروں میں مسلم بھی ہوتے ہیں اور غیر مسلم بھی۔ اس طرح یہ ادارے فطری طور پر ایک ایسا مقام بن گئے ہیں جہاں اسلام کی علمی نمائندگی کی جائے اور اعلیٰ علمی سطح پر اسلام پیش کیا جا سکے۔ مزید یہ کہ ان اداروں کے ذریعہ یہ عمل نسل در نسل مسلسل طور پر جاری رہ سکتا ہے۔

موجودہ نظام تعلیم کا یہ پہلو اسلامی دعوت کے لیے زبردست امکان کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی سیکولر ملک میں اگرچہ یہ موقع نہیں کہ ابتدائی مرحلہ میں سیکولر علوم کے ساتھ اسلام یا کسی دوسرے مذہب کی باقاعدہ تعلیم دی جا سکے۔ لیکن مختلف یونی ورسٹیوں میں اکثر گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن مرحلہ میں دوسرے علوم کے شعبوں کے ساتھ اسلامک اسٹڈیز کا بھی شعبہ ہوتا ہے جس میں اسلامیات پر بی اے، ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دی جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ لسانیات کے شعبہ میں اردو، عربی اور فارسی وغیرہ مسلم زبانوں کے بھی شعبے قائم ہیں۔ جن میں نہ صرف مسلم، بلکہ غیر مسلم طلبہ بھی مختلف سیاسی اور اقتصادی اسباب کی بنا پر داخلے لیتے ہیں۔

یونیورسٹیوں میں اسلامیات اور اسلامی زبانوں سے متعلق شعبوں کے ذریعہ اسلام کی دعوت و تبلیغ کا کام فطری طور پر جاری ہو جاتا ہے۔ ان شعبوں سے وابستہ غیر مسلم طلبہ اور اساتذہ جب کسی اسلامی موضوع پر ریسرچ کرتے ہیں تو ان کے سامنے ایک ایسے مذہب کی تصویر آتی ہے، جو ان کے آبائی مذہب سے مختلف ہوتا ہے، وہ محسوس کرتے ہیں کہ اسلامی عقائد اور تعلیمات ان کے اپنے مذہب کے عقائد اور تعلیمات سے زیادہ معقول اور انسانی فطرت کو زیادہ اپیل کرنے والی ہیں۔ اس تقابل اور انکشاف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام سے نہایت شدت کے ساتھ متاثر ہو جاتے ہیں۔

اور ان کی ایک تعداد شعوری فیصلہ کے تحت اسلام قبول کر لیتی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ سیکولر نظامِ تعلیم کے اس مثبت پہلو کو اہلِ اسلام سنجیدگی کے ساتھ سمجھیں، اور اپنے بچوں کو حتی الامکان اسلام کے صحیح عقائد اور تعلیمات سے واقف کرانے کی کوشش کریں۔ تاکہ اسکول اور کالج کی زندگی میں، جب غیر مسلم طلبہ سے ان کا اختلاط ہو اور وہ اسلام کے بارے میں کچھ جاننا چاہیں تو وہ انھیں ضروری معلومات دے سکیں، اور اس طرح اسلام کی دعوت وتبلیغ کے عظیم عمل میں اپنے آپ کو شامل کر سکیں۔

کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے اندر ایسے مختلف شعبے ہوتے ہیں جو براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اسلام سے متعلق ہوتے ہیں۔ مثلاً اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ اگر براہِ راست طور پر اسلام سے متعلق شعبہ ہے تو عربی زبان اور تاریخ بالواسطہ طور پر اسلام سے متعلق شعبہ ہے۔ اس طرح اکثر شعبوں میں ایسا ہوتا ہے کہ مطالعہ کے دوران کہیں نہ کہیں اسلام کا ریفرنس آجاتا ہے۔

یہ صورتِ حال اہلِ اسلام کو اسلام کے دعوت وتعارف کا زبردست موقع دے رہی ہے۔ طالب علم کی حیثیت سے وہ سوال وجواب کی صورت میں لوگوں کو اسلام کی بات بتا سکتے ہیں۔ استاد کی حیثیت سے وہ اپنے لیکچر میں ایسے مواقع پا سکتے ہیں جہاں وہ اسلام کا حوالہ دے سکیں۔ ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے وہ ایسے موضوعات کا انتخاب کر سکتے ہیں جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر اسلام سے متعلق ہوں اور خالص علمی سطح پر اسلام کی نمائندگی کر سکیں۔

موجودہ زمانہ کی ایک یونیورسٹی، گویا علم کا ایک شہر ہوتی ہے۔ جہاں ہر قسم کی علمی سرگرمیاں نہایت اعلیٰ سطح پر جاری رہتی ہیں۔ ایسے علمی شہر ساری دنیا میں ہزاروں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ہر ملک کی حکومتیں ان علمی شہروں کو غیر معمولی امداد دیتی ہیں تاکہ وہ اعلیٰ پیمانہ پر چلائے جا سکیں۔

یہ ایک نیا دعوتی امکان ہے۔ جو موجودہ زمانہ میں پیدا ہوا ہے۔ اگر اس کو حکمت کے ساتھ استعمال کیا جائے تو ہر تعلیمی ادارہ عملاً ایک دعوتی ادارہ بن جائے گا۔

مذہبی تعصب کا خاتمہ

قدیم زمانہ مذہبی تعصب کا زمانہ تھا۔ موجودہ زمانہ مذہبی بے تعصبی کا زمانہ ہے۔ اس فرق نے موجودہ زمانہ میں دعوتِ اسلامی کے کام کے لیے نئے مواقع کھول دیے ہیں، ایسے مواقع جو شاید اس سے پہلے کبھی موجود نہ تھے۔

قدیم زمانہ میں مذہب صرف ایک عقیدہ کی چیز سمجھا جاتا تھا، مذہب کے علمی مطالعہ کا رواج نہ تھا۔ ہر مذہب سے وابستہ لوگوں کا حال یہ تھا کہ ان کی کتابوں میں جو لکھا ہوا تھا یا ان کے بڑوں نے جو کچھ کہہ دیا تھا وہ ان کے نزدیک اٹل اور مقدس تھا۔ اس کے بارے میں مزید غور و فکر کی ضرورت نہ تھی۔ اس مزاج نے ہر مذہبی حلقہ میں تعصب کا ماحول پیدا کر رکھا تھا۔ ہر مذہبی گروہ کا حال یہ تھا کہ وہ علم کی بنیاد پر کھڑے ہونے کے بجائے صرف تعصب کی بنیاد پر کھڑا ہوا تھا۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ میرا مذہب ہر حال میں درست ہے، اور دوسرا مذہب ہر حال میں غلط۔

مذہبی تعصب کے اس ماحول میں قدیم زمانہ میں دعوت کا کام انتہائی مشکل تھا۔ جہاں ہر آدمی اپنے آپ کو ذہنی خول میں بند کیے ہوئے ہو، وہاں کوئی نئی بات باہر سے اس کے اندر ڈالی نہیں جا سکتی ہے۔ تاریخ کا یہ تجربہ ہے کہ مذہبی تعصب ہر دور میں کسی نئے مذہبی فکر کو قبول کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔

موجودہ دور تاریخ کا پہلا دور ہے، جب کہ اس مذہبی تعصب کا خاتمہ ہو گیا۔ کم از کم اصولی طور پر مذہبی تعصب کو سخت معیوب چیز سمجھا جانے لگا۔ آج علمی حلقوں میں ایک شخص فخر کے ساتھ یہ کہتا ہوا سنائی دے گا کہ میں مذہب کے معاملہ میں روادار ہوں، میں غیر جانب داری کے ساتھ ہر مذہب کا مطالعہ کرتا ہوں۔ اس کے برعکس مذہبی تعصب یا مذہبی نارواداری کی وکالت کرنے والا شاید ساری دنیا میں کوئی نہیں ملے گا۔

مذہبی فکر میں یہ انقلاب سائنس کے اثر سے آیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی طریقہ، مطالعہ غالب طریقۂ مطالعہ سمجھا جاتا ہے۔ سائنس میں چونکہ موضوعیت (objectivity)

انتہائی طور پر ضروری ہے۔ متعصبانہ طرزِ فکر سائنسی مطالعہ کے لیے قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے جب سائنس میں غیر متعصبانہ طریقۂ مطالعہ رائج ہوا تو بقیہ تمام شعبوں میں بھی یہی طریقہ چھاتا چلا گیا، یہاں تک کہ مذہب سمیت تمام شعبوں میں غیر متعصبانہ طریقِ فکر ہی غالب اور مستند فکر بن گیا۔

یہ حالات اسلامی دعوت کے لیے فتح باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس زمانی تبدیلی نے آج یہ ممکن بنا دیا ہے کہ ضد اور تعصب جیسی غیر ضروری رکاوٹوں میں الجھے بغیر دعوتِ حق کا کام کھلی فضا میں کیا جا سکے۔ داعی جب اپنی بات کہے تو مدعو اُس کو سنجیدگی کے ساتھ سنے اور کسی ذہنی رکاوٹ کے بغیر اس پر غور کرے۔

شمشاد محمد خان صاحب (برمنگھم) نے بتایا کہ چند انگریز کاریگر اُن کے گھر پر کچھ تعمیری کام کر رہے تھے۔ شمشاد محمد خان نے ان سے مسیحیت کے عقیدہ کفارہ پر گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ دیکھو، تمہاری کلرجی تم کو کس طرح بے وقوف بنا رہی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مسیح مصلوب ہو کر تمہارے گناہوں کا کفارہ بن گئے۔ کیا تمہاری عقل اس کو مانتی ہے کہ گناہ ایک شخص کرے اور اس کی سزا کوئی دوسرا شخص بھگتے۔ انگریز نوجوانوں نے شمشاد صاحب کی بات غور سے سنی اور پھر کہا۔ مسٹر خان، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے شمشاد صاحب سے کہا کہ آپ ہمیں اسلام پر کتابیں دیجئے ہم ان کا مطالعہ کریں گے۔

قدیم زمانہ میں یہ ممکن نہیں تھا کہ اس قسم کی تنقیدی گفتگو دو مذہب والوں کے درمیان ہو، اور پھر بھی دونوں کے درمیان سنجیدہ اور معتدل فضا بدستور باقی رہے۔

یہ ایک نیا امکان ہے جو دعوتِ حق کی موافقت میں پیدا ہوا ہے۔ آج کے داعی کے لیے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ وہ اسلام کا پیغام دوسرے مذہب والوں کو کھلے طور پر دے اور پھر بھی داعی اور مدعو کے درمیان کوئی ناخوش گواری پیدا نہ ہو۔ جس طرح علمی موضوعات پر دو آدمی ٹھنڈے ماحول میں گفتگو کرتے ہیں، اسی طرح آج یہ ممکن ہو گیا ہے کہ دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی صداقت کو کھلے طور پر بیان کیا جائے اور سننے والا اس کو ٹھنڈے طور پر سنے، اس پر سنجیدہ بحث کرے یہاں تک کہ جب اس کا ذہن اس کی حقانیت کی گواہی دے تو وہ اس کو قبول کر لے۔

عالمی سیاحت

سیاحت کا رواج قدیم ترین زمانہ سے پایا جاتا ہے۔ مگر قدیم زمانہ میں سفر اتنا مشکل اور دیر طلب تھا کہ صرف بعض حوصلہ مند افراد ہی اس کی جرأت کر سکتے تھے۔ مثلاً ابن بطوطہ اور مارکوپولو وغیرہ۔ مگر موجودہ زمانہ میں وسائل سفر کی سہولتوں نے سیاحت کے رواج کو بہت زیادہ بڑھادیا ہے۔ قدیم زمانہ میں سیاحت اگر انفرادی تھی تو اب سیاحت ایک اجتماعی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

سیاحت (ٹورزم) کے اس پھیلاؤ نے موجودہ زمانہ میں دعوت کے لیے نئے امکانات کھول دیے ہیں۔ سیاحوں کی یہ عالمی نقل و حرکت مسلسل جاری رہتی ہے۔ وہ بڑی تعداد میں ہر ملک میں پہنچ رہے ہیں۔ کہیں مناظر فطرت کو دیکھنے کے لیے، کہیں موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے، کہیں مختلف انسانی سماج کے مطالعہ کے لیے، کہیں تاریخی آثار اور تاریخی عمارتوں کو دیکھنے کے لیے، وغیرہ۔ یہ سیاحت گویا ایک عالمی انسانی سیلاب ہے جو ہر موسم میں اور ہر مقام پر بھاری تعداد میں پہنچ رہا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان نہ صرف مخصوص مسلم ملکوں میں آباد ہیں۔ بلکہ وہ ساری دنیا میں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ اس طرح ان کا سابقہ بار بار ان مردوں اور عورتوں سے پیش آتا ہے جو سیاحت کی غرض سے مسلسل ہر جگہ جا رہے ہیں۔ اس واقعہ میں ایک عظیم دعوتی اہمیت چھپی ہوئی ہے۔ گویا کہ سیاحوں کے روپ میں مدعو خود داعی کے پاس پہنچ رہا ہے۔ پیاسا خود چل کر کنویں کے پاس آگیا ہے۔

اس صورت حال نے دور جدید کے اہل ایمان کو یہ موقع دے دیا ہے کہ وہ خدا کے پیغام کی عالمی پیغام رسانی کے کام کو خود اپنے رہائشی مقامات پر رہتے ہوئے انجام دے سکیں۔ جس کے لیے اس سے پہلے لمبے اور دشوار گزار سفر کا مرحلہ طے کرنا پڑتا تھا۔

یہ سیاح جن کی ننانوے فیصد سے زیادہ تعداد غیر مسلموں پر مشتمل ہوتی ہے۔ وہ گویا کہ اپنے گھروں سے نکل کر اہل ایمان کے پاس آرہی ہے اور بزبان حال یہ کہہ رہی ہے کہ تمہارے

پاس خدا کی طرف سے جو آئی ہوئی امانت ہے اس کو ہمیں دو، حق کو اس کے حق دار تک پہنچاؤ۔ اگر تم نے یہ امانت ہمیں نہ سونپی تو ہم خدا کے یہاں تمہارا دامن پکڑلیں گے اور خدا سے کہیں گے کہ جب انھوں نے ہمیں جنت کا راستہ نہیں دکھایا تو وہ خود بھی جنت میں جانے کے مستحق نہیں۔

سیاحوں کی یہ عالمی نقل و حرکت اہل ایمان کے لیے ایک دعوتی موقع ہے اور اسی کے ساتھ ایک بھاری ذمہ داری بھی۔ ان حالات کا تقاضا ہے کہ اہل اسلام اس کے بارہ میں پوری طرح باشعور ہوں اور وہ سارے اہتمام کریں جو ان نئے مواقع کے دعوتی استعمال کے لیے ضروری ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ ہر مقام پر کچھ ایسے افراد موجود ہونے چاہئیں جو ایک طرف دین کی تعلیمات سے بخوبی واقف ہوں۔ اور اسی کے ساتھ بیرونی مقامات سے آنے والے سیاحوں کی زبان بھی اچھی طرح جانتے ہوں۔ تاکہ ان کے سامنے خود ان کی قابلِ فہم زبان میں دین حق کی وضاحت کرسکیں۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان سیاحوں کو دینے کے لیے ہر زبان میں موثر قسم کا اسلامی لٹریچر تیار کیا جائے جس میں اسلام کا تعارف مثبت انداز میں کیا گیا ہو اور اس میں وقت کے سوالات کا جواب بھی ہو۔ یہ لٹریچر مکمل طور پر غیر مناظرانہ، غیر قومی اور غیر سیاسی اسلوب میں ہونا چاہیے۔ اس میں فطرت کی زبان میں اسلام کا اظہار ہونا چاہیے مسلم قومی ذہن سے اس کو مکمل طور پر پاک ہونا چاہیے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے ساتھ تالیفِ قلب کا معاملہ کیا جائے۔ تالیفِ قلب کا یہ معاملہ انفرادی بھی ہونا چاہیے اور اجتماعی بھی۔ مثلاً مغربی ملکوں سے آنے والے سیاح اگر لباس اور طور طریقہ کے معاملہ میں اسلامی کلچر کے مطابق نہ ہوں تو اس کو گوارہ کیا جائے نہ کہ اس کو موضوع بنا کر انھیں پریشان کیا جائے۔

عالمی سیاحوں کی یہ نقل و حرکت گویا مدعو کی نقل و حرکت ہے۔ اس واقعہ نے داعی گروہ کے لیے دعوتی کام کو نہایت آسان بنا دیا ہے۔

جدید نظامِ تعلیم

موجودہ زمانہ میں جو تعلیمی نظام رائج ہوا ہے اس نے اسلامی دعوت کا ایک نیا امکان کھول دیا ہے، جو اس سے پہلے کبھی موجود نہ تھا۔ اگر اس امکان کو منظم طور پر استعمال کیا جائے تو وہ نسل در نسل اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بن جائے گا۔ قدیم زمانہ میں جو نظامِ تعلیم رائج تھا اس کے تحت زیادہ تر درسگاہیں کسی مخصوص مذہب سے متعلق ہوتی تھیں اور ان میں اسی مذہب سے وابستہ افراد تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس بنا پر قدیم زمانہ میں تعلیمی ادارے اہل مذاہب کے درمیان اختلاط (interaction) کا ذریعہ نہیں بن سکتے تھے۔ یہ زیادہ تر موجودہ زمانہ کی خصوصیت ہے کہ تعلیم گاہوں میں ہر مذہب اور ہر کلچرل گروہ کے لوگ تعلیم پا رہے ہیں۔ اس طرح مختلف اہل مذاہب کے درمیان فطری انداز میں اختلاط پیش آتا رہتا ہے۔

یہ تعلیمی نظام سیکولر سوسائٹی کی پیداوار ہے۔ موجودہ زمانہ میں فطرت کے مطالعہ نے سیکڑوں نئے علوم پیدا کیے۔ ان علوم کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ علوم تمام تر دنیاوی علوم تھے، جو ہر ایک کی دل چسپی کا باعث ہوتے ہیں۔ ان نئے فطری علوم کی دریافت کے نتیجہ میں نئے قسم کے سیکولر ادارے پیدا ہوئے اور نئی سیکولر سوسائٹی کی تشکیل ہوئی۔ اس طرح یہ واقعہ پیش آیا کہ بڑی تعداد میں ایسے تعلیمی ادارے بننے لگے جہاں ہر طبقہ کے لوگ اکٹھا ہو کر تعلیم پا رہے ہوں۔

مذاہب کا یہ اختلاط اپنے آپ تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ بن گیا۔ مثلاً ایک ادارہ میں کچھ مسلمان طالب علم ہیں۔ جب وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو آپس میں السلام علیکم کہتے ہیں۔ دوسری طرف کچھ غیر مسلم طالب علم ہیں۔ وہ جب آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو ہائے، ہائے کہتے ہیں۔ اب مسلمان طالب علم غیر مسلم سے پوچھے گا کہ ہائے، ہائے کا کیا مطلب ہے۔ اسی طرح غیر مسلم طالب علم مسلمان سے پوچھے گا کہ السلام علیکم کا کیا مطلب ہے۔ اس طرح فطری ماحول میں اسلام اور غیر اسلام کا تقابل پیش آئے گا یہاں تک کہ دونوں مذہب سے وابستہ افراد کے درمیان معتدل انداز میں ڈائیلاگ شروع ہو جائے گا۔ غیر مسلم طلبہ اسلام پر کتابیں حاصل

کر کے پڑھیں گے یا اپنے ہم جماعت مسلم طلبہ سے اسلام کے بارے میں پوچھیں گے، وغیرہ۔

اس طرح ان سیکولر تعلیم گاہوں نے اسلام کی دعوت کا ایک نیا اور طاقت ور میدان کھول دیا ہے۔ اگر مسلم گھرانوں میں یہ ماحول ہو کہ وہاں ان کے بچے اسلام کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر رہے ہوں تو ہر مسلم طالب علم عملاً ایک مبلغ بن جائے گا۔ مزید یہ کہ تعلیم چوں کہ ایک جاری عمل ہے اس لیے تعلیم گاہ ایک ایسا ادارہ ہوتا ہے جس میں یہ صلاحیت ہے کہ اگر اس کو استعمال کیا جائے تو دعوت کا عمل نسل در نسل جاری رہے گا۔

اسی طرح ان تعلیمی اداروں میں طرح طرح کی اجتماعی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں مثلاً ڈبیٹ (مباحثہ) اور دوسرے قسم کے علمی اور تعلیمی مذاکرے، ان بحثوں اور مذاکروں میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں جہاں مختلف مذاہب کا تقابلی تذکرہ ہوتا ہے یا اور کسی سبب سے مذہب کا ذکر آجاتا ہے۔ ایسی مجلسیں مسلم طالب علموں کو یہ سنہرا موقع دیتی ہیں کہ وہ سنجیدہ اور دل نشیں انداز میں لوگوں کو اسلام سے متعارف کریں۔ وہ خاموش انداز میں اسلام کے داعی اور مبلغ بن جائیں۔

علم اپنی ذات میں ایک متنوع مضمون ہے۔ ہر علمی شعبہ کہیں نہ کہیں دوسرے علمی شعبوں سے مل جاتا ہے۔ ایک علمی موضوع پر کلام کرتے ہوئے آدمی کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ دوسرے علمی موضوعات پر اظہار خیال کر سکے۔

علم کی یہ خصوصی نوعیت طلبہ اور اساتذہ دونوں کو یہ موقع دیتی ہے کہ وہ بار بار اسلام کے تعارف کے امکانات پا سکیں۔ اگر مسلم طلبہ اور اساتذہ گہرے طور پر باشعور ہوں اور اسی کے ساتھ ساتھ اسلام کی معلومات رکھتے ہوں تو ہر تعلیمی ادارہ تعلیم کے ساتھ اسلام کے تعارف کا ادارہ بن جائے گا۔ اور یہ سب کچھ خالص فطری انداز میں ہوگا نہ کہ کسی قسم کے مصنوعی انداز میں۔ اور فطری انداز ہمیشہ مصنوعی انداز سے زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں علمی اور تعلیمی سرگرمیاں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں، ان سرگرمیوں میں ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ شامل ہوتے ہیں، اس طرح جو اختلاط واقع ہوتا ہے وہ دعوتی عمل کے لیے نہایت مفید ہے۔ اگر داعی گروہ کے اندر دعوتی شعور زندہ ہو تو اس قسم کے تمام مقامات دعوت کا میدان بن جائیں۔

نظریات کی ناکامی

قدیم ترین زمانہ سے انسان کچھ نظریات کے سحر میں مبتلا رہا ہے۔ یہ نظریات اس کے لیے حق کی معرفت میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ مگر موجودہ زمانہ میں یہ خود ساختہ نظریات بے بنیاد ثابت ہوگئے۔ علمی حقائق نے ان کا باطل ہونا اس طرح واضح کر دیا کہ اب کسی کے لیے یہ گنجائش باقی نہیں رہی کہ وہ ان نظریات کی زمین پر کھڑا ہو سکے۔

اس واقعہ نے موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے لیے نئے مواقع کھول دیے ہیں۔ اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ کسی رکاوٹ کے بغیر دینِ حق کی دعوت کو لوگوں کے لیے قابلِ قبول بنایا جا سکے۔

۱۹۱۷ میں سوویت یونین قائم ہوا۔ اس کے بعد حکومتی طاقت سے یہ پروپیگنڈا کیا جانے لگا کہ انسان کی فکری نارسائی آخری طور پر ختم ہوگئی ہے۔ مارکسی نظریہ کی صورت میں انسان نے اس سچائی کو آخری طور پر پالیا ہے جس کو وہ ہزاروں سال سے تلاش کر رہا ہے۔ سوشلسٹ ایمپائر کے تمام وسائل کے ذریعہ یہ پروپیگنڈا ساری دنیا میں پھیلا دیا گیا یہاں تک کہ دنیا کے بیشتر ذہن اس سے متاثر ہوگئے۔ لیکن پروپیگنڈے کے یہ تمام الفاظ فضا میں تحلیل ہوگئے اور آخر کار یہ نوبت آگئی کہ ۱۹۹۱ میں سوویت یونین ٹوٹ گیا۔

جب تک سوویت یونین قائم تھا، کروروں لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ انھوں نے زندگی کی اس آئیڈیالوجی کو پالیا ہے جس کی انھیں ضرورت تھی۔ مگر سوویت یونین کی ناکامی کے بعد اب ساری دنیا میں ایک نظریاتی خلا (ideological vacuum) پیدا ہوگیا ہے۔ لوگ اپنے آپ کو فکری سہارے سے محروم سمجھنے لگے ہیں۔ انھیں دوبارہ اس بات کی تلاش ہے کہ وہ اس حقیقی آئیڈیالوجی کو پالیں جو ان کے لیے ان کی روحانی تلاش کا جواب ہو۔

اسی طرح خدا کے وجود کو نہ ماننے یا اس پر شک کرنے کے لیے انسان نے بہت سے نظریات وضع کر رکھے تھے۔ مگر آج یہ تمام نظریات باطل قرار پا چکے ہیں۔ مثلاً یہ نظریہ کہ کائنات اپنی خالق آپ ہے اور وہ ہمیشہ سے اسی طرح چلی آرہی ہے۔ لیکن بگ بینگ نظریہ نے اس

مفروضہ کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا ہے۔ اب کسی کے لیے یہ ماننے کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ کائنات اپنی خالق آپ ہے۔

اس طرح کی مختلف دریافتوں نے خدا کے وجود کو خالص سائنسی بنیادوں پر انسان کے لیے قابلِ فہم بنا دیا ہے۔ جدید علم نے ان تمام بنیادوں کو ڈھا دیا ہے جن پر الحاد اور تشکیک کے نظریات قائم تھے۔ اس طرح جدید حالات نے اب دعوت حق کے لیے نئے دروازے کھول دیے ہیں۔ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ خالص علمی نوعیت کے طاقت ور دلائل کے ساتھ اسلام کے پیغام کو لوگوں تک پہنچایا جا سکے۔

اسی طرح قدیم ترین زمانہ سے انسان اس فریب میں مبتلا رہا ہے کہ وہ اس دنیا میں اپنی جنت بنا سکتا ہے۔ ہر دور میں انسان یہ کوشش کرتا رہا ہے کہ وہ اپنے لیے ایک ایسی دنیا بنائے جس کے اندر وہ خوشیوں اور لذتوں کی پُر راحت زندگی گزار سکے۔ مگر موجودہ زمانہ میں انسان کا یہ سحر بھی مکمل طور پر باطل ہو گیا۔

موجودہ زمانہ میں فطرت کے چھپے ہوئے راز دریافت ہوئے۔ ٹکنالوجی کی نئی ترقیوں نے اس بات کو ممکن بنا دیا کہ مادہ کو ایک خوب صورت اور پُر رونق تہذیب میں تبدیل کیا جا سکے۔ بیسویں صدی میں یہ کام بہت بڑے پیمانہ پر کیا گیا۔ مگر جب یہ خوب صورت اور پر رونق تہذیب بن کر تیار ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ صرف ایک خوب صورت پنجرہ ہے نہ کہ خوب صورت محل۔

مادہ کو پر رونق تہذیب میں تبدیل کرنے کے لیے جو کارخانے بنائے گئے اور جو مشینیں تیار کی گئیں ان کی بہت مہنگی قیمت انسان کو دینی پڑی۔ کارخانوں سے بہنے والے فضلہ نے دریاؤں کے پانی کو گندا کر کے آبی کثافت (water pollution) کا مسئلہ پیدا کر دیا۔ مشینوں کی گڑگڑاہٹ نے آواز کی کثافت (noise pollution) کا مسئلہ پیدا کیا۔

جدید تہذیب کی مثال ایک ایسے خوبصورت محل کی ہے جو سارا کا سارا کثیف دھوئیں سے بھرا ہوا ہو، جو بظاہر دیکھنے میں اچھا معلوم ہو، مگر اس کے اندر زندگی گزارنا اتنا ہی زیادہ مشکل نظر آتا ہو۔ ان حالات نے موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کی کامیابی کے امکانات کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔

بین اقوامی زبان

حدیث میں آیا ہے کہ حضرت مسیح نے اپنے حواریوں سے کہا کہ تم لوگ مختلف ملکوں میں جاؤ اور وہاں کے لوگوں کو میرا پیغام پہنچاؤ۔ حواری جانے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ انھیں یہ ڈر تھا کہ جن قوموں کی زبان وہ جانتے نہیں پھر انھیں وہ کس طرح اپنا مخاطب بنائیں گے۔ اس کے بعد حضرت مسیح نے دعا کی تو ہر حواری اس قوم کی زبان بولنے لگا جس قوم کی طرف اس کو بھیجا جا رہا تھا (سیرۃ ابن ہشام، جلد ۴ صفحہ ۲۷۹ - ۲۷۸)

یہ حضرت مسیح کا معجزہ تھا۔ قدیم زمانہ میں مختلف قوموں میں دعوت پہنچانے کے لیے پیغمبرانہ معجزہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ مگر موجودہ زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے خود حالات کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کی ہے کہ آج پیغمبرانہ معجزہ کے بغیر ایک داعی مختلف قوموں بلکہ ساری دنیا میں اسلام کا پیغام پہنچا سکتا ہے۔

یہ نیا دعوتی موقع بین اقوامی زبان کی صورت میں پیدا ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ انسانی تاریخ کا پہلا زمانہ ہے جب کہ ایک ایسی زبان وجود میں آئی ہے جو کہ بین اقوامی زبان ہے۔ یہ انگریزی ہے۔ آج انگریزی زبان کو جاننے اور سمجھنے والے ساری دنیا میں موجود ہیں۔ آج تقریباً ہر ملک میں انگریزی زبان کے ذریعہ لوگوں کو خطاب کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر بالفرض کسی مقام پر لوگ عمومی طور پر انگریزی نہ جانتے ہوں تب بھی وہاں ایسے افراد مل جائیں گے جو آپ کی انگریزی تقریر کا مقامی زبان میں ترجمہ کر سکیں۔

انگریزی زبان کو یہ غیر معمولی حیثیت لمبے تاریخی عمل کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ برٹش ایمپائر نے اپنے دو سو سالہ حکومت کے زمانہ میں ساری دنیا میں انگریزی زبان کو رواج دیا۔ دوسری جنگ عظیم نے برٹش امپائر کو کمزور کیا تو فوراً ہی "امریکن امپائر" اور بھی زیادہ طاقت کے ساتھ انگریزی زبان کو فروغ دینے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اسی کے ساتھ اقوام متحدہ، جدید ٹی وی، پبلشنگ ادارے، یونی ورسٹیاں، صحافت اور دوسرے مختلف ادارے انگریزی کو عمومی زبان بنانے میں زبردست مدد کرتے رہے، یہاں تک کہ آج انگریزی زبان کو

بلامبالغہ ایک عالمی زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس طرح دنیا میں ایک بین اقوامی زبان وجود میں آئی ہے۔
یہ صورت حال اسلام کے داعی کے لیے ایک عظیم نعمت ہے۔ اس نے تاریخ میں پہلی بار یہ امکان پیدا کیا ہے کہ اہل اسلام خدا کے دین کی دعوت کو عالمی سطح پر تمام انسانوں تک پہنچا دیں۔ وہ ایک زبان میں مہارت پیدا کر کے تمام قوموں کو اپنا مخاطب بنا سکیں۔

دنیا میں کئی ہزار زبانیں ہیں جو مقامی طور پر لکھی اور بولی جاتی ہیں مقامی مسلمانوں کو یقیناً یہ زبانیں سیکھنی چاہئیں۔ مقامی زبانیں جاننا مختلف پہلوؤں سے اسلام اور مسلمانوں کے لیے گہرے فائدے کا سبب ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اجتماعی سطح پر انگریزی زبان کی بے حد اہمیت ہے۔ اور اس کی سخت ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے لوگ قابل لحاظ تعداد میں موجود ہوں جو انگریزی میں لکھنے اور بولنے کی اچھی قدرت رکھتے ہوں۔

اس سلسلہ میں ایک بے حد اہم کام یہ ہے کہ ایسے لسانی ادارے قائم کیے جائیں جہاں عربی زبان اور انگریزی زبان کی تعلیم کا اچھا انتظام ہو۔ عربی داں مسلم نوجوانوں کو یہاں رکھ کر اچھی انگریزی سکھائی جائے۔ اسی طرح انگریزی داں مسلم نوجوانوں کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ یہاں آکر عربی زبان کی اچھی واقفیت حاصل کریں۔ اس طرح دونوں زبانوں کو جاننے والے مسلمانوں کی ٹیم تیار کی جائے اور یہ سلسلہ نسل در نسل برابر جاری رہے۔

اس قسم کا لسانی ادارہ قرآن کی اس آیت کا مصداق ہوگا جس میں یہ کہا گیا ہے کہ:
اور یہ ممکن نہ تھا کہ اہل ایمان سب کے سب نکل کھڑے ہوں۔ تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک حصہ نکل کر آتا تاکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کرتا اور واپس جا کر اپنی قوم کے لوگوں کو آگاہ کرتا تاکہ وہ بچنے والے بنیں (التوبہ ۱۲۲)

یہ ممکن نہیں کہ سارے اہل اسلام بین اقوامی زبان میں مہارت پیدا کریں۔ اس لیے یہ ہونا چاہیے کہ ان کی ایک منتخب تعداد مذکورہ انداز میں عربی اور انگریزی دونوں زبان سیکھے۔ اس کے بعد یہ لوگ اس دعوتی ذمہ داری کو پوری امت کی طرف سے انجام دیں۔ وہ دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے انسانوں کو وقت کی بین اقوامی زبان میں اسلام کا پیغام پہنچا دیں۔

امکانات کا استعمال

موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے لیے نئے امکانات کھل گئے ہیں۔ان کے ذریعہ دعوت کو نہایت موثر طور پر زیادہ وسیع دائرہ میں انجام دیا جاسکتا ہے،مگر اس استعمال کی کچھ لازمی شرطیں ہیں۔ان شرطوں کو ملحوظ رکھے بغیر نئے امکانات کا دعوتی استعمال ممکن نہیں ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ میں مذہب کے مطالعہ کا نیا رجحان پیدا ہوا ہے ، بے شمار لوگ مذہب کی طرف از سر نو راغب ہو رہے ہیں۔یہ منظر اتنا عام ہے کہ اس کو ہر ملک میں اور ہر طبقہ کے لوگوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

مذہب کے مطالعہ کا یہ نیا رجحان کیوں پیدا ہوا ہے۔اس کی وجہ دراصل غیر مذہبی چیزوں کی طرف سے انسان کی مایوسی ہے۔آج کا انسان جنگی نظریات کے تجربوں سے سخت مایوس ہو گیا ہے۔متشددانہ قومیت ، مارکسزم اور نازیزم کے جارحانہ فلسفوں سے اس کو نہایت تلخ تجربے پیش آئے ہیں۔نئے ہتھیاروں کی ہلاکت خیزی کو دیکھ کر وہ جنگ سے سخت متوحش ہو گیا ہے۔وہ ایسے متبادل نظریہ کی تلاش میں ہے جو جنگ کے بغیر انسانیت کی فلاح کا راستہ بتاتا ہو۔

ایسی حالت میں اسلام کو اگر جنگ وقتال کے نظریہ کے طور پر پیش کیا جائے تو آج کے انسان کو اس سے دل چسپی نہ ہوگی۔آج کا انسان صرف ایسے مذہب میں دلچسپی لے سکتا ہے جس کے پاس انسانیت کی فلاح کے لیے پُر امن تدبیر کا نسخہ موجود ہو۔اس کے برعکس جو مذہب جنگ اور ٹکراؤ میں انسانی مسائل کا حل بتائے وہ آج کے انسان کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آج جو لوگ اسلام کی دعوت کے لیے اٹھیں انھیں اس طرح کام کرنا چاہیے کہ دنیا کی نظروں میں وہ مذہب امن کے داعی قرار پائیں نہ کہ مذہب جنگ کے داعی۔آج کی دنیا جنگ سے اتنی زیادہ الرجک ہو چکی ہے کہ وہ کسی بھی حال میں کسی ایسے

مذہب یا نظام پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں جو تشدد پر بنی ہو۔ آج کی دنیا کا مطلوب مذہب صرف وہ بن سکتا ہے جو جنگ کو ہر حال میں خارج از بحث قرار دے اور صرف پُرامن تدابیر کے ذریعہ زندگی کے مسائل کا حل بتائے۔

اسی طرح جدید ذہن کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ مادّیت سے اُکتا چکا ہے، مشینوں کی گڑگڑاہٹ اور جدید صنعت کے منفی نتائج نے اس کو مادی نظاموں سے سخت بیزار کر دیا ہے۔ وہ مادیت کی ظاہری رونقوں سے اُکتا کر روحانی سکون کی تلاش کر رہا ہے۔

ایسی حالت میں آج کے انسان کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے لیے کارگر تدبیر صرف یہ ہے کہ اس کے سامنے اسلام کے روحانی پہلو کو موثر انداز میں پیش کیا جائے۔ اسلام کی اس روحانیت کو اس کے سامنے واضح کیا جائے جس کو اسلام میں ربانیت کہا گیا ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (سن لو کہ اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے) یہی اسلام کی اصل حقیقت ہے۔ اسلام بتاتا ہے کہ انسان کا اصل مطلوب خدا ہے، خدا کی معرفت ہی وہ چیز ہے جو ذہن و فکر کی دنیا کو روشن کرتی ہے۔ خدا کی یادوں میں جینا، یہی وہ چیز ہے جس سے دل کی دنیا آباد ہوتی ہے اور قلب و روح کی دنیا کو سکون کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ جو آدمی خدا کو پالے اس کے سینہ میں آفاقی سکون کا باغ اُگ آتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ ربانی سمندر میں نہائے اور اطمینان قلب کی ایک بلند تر زندگی حاصل کر لے۔

موجودہ زمانہ میں وسیع پیمانہ پر یہ امکان پیدا ہوا ہے کہ آج کے انسان کو اسلام کی طرف راغب کیا جائے۔ مگر یہ اُسی وقت ممکن ہے جب کہ انسان کو اسلام پھولوں کا ایک گلدستہ معلوم ہو نہ کہ کانٹوں کا ایک مجموعہ۔ وہ جب اسلام کا تعارف پائے تو اسے محسوس ہو کہ وہ اس کے اپنے دل کی آواز ہے۔ یہ عین وہی دین رحمت ہے جس کی تلاش میں وہ مدتوں سے سرگرداں تھا۔

قرآن میں داعی کی زبان سے کہا گیا ہے کہ ولنصبرن علیٰ ما آذیتمونا (ابراہیم ۱۲) یعنی تمہاری ایذاؤں پر ہم صرف صبر ہی کریں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ داعی کا طریقہ مدعو کی زیادتیوں پر

یک طرفہ صبر کرنا ہے۔ یہ صبر اس لیے ہوتا ہے تاکہ داعی اور مدعو کے درمیان اعتدال کی فضا باقی رہے، وہ کسی حال میں بگڑنے نہ پائے۔

آج کا انسان مذہبِ امن کی تلاش میں ہے۔ ایسی حالت میں اہل اسلام کو یک طرفہ صبر کرکے ہر حال میں ٹکراؤ کی روش سے باز رہنا ہے، تاکہ اسلام کے مذہبِ امن ہونے کی حیثیت مدعو کی نظر میں مجروح نہ ہونے پائے۔ آج کا انسان دینِ روحانیت کی تلاش میں ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کے داعیوں کو آخری حد تک اس سے پرہیز کرنا ہے کہ وہ اسلام کو اس انداز سے پیش کریں کہ جدید انسان کو وہ صرف سیاسی اور حکومتی نظام کی کوئی اسکیم نظر آئے۔

آج کا انسان اسلام کے دروازہ پر کھڑا ہوا ہے، اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ صرف اسلام کا طالب ہے۔ دعوت کا عمل اگر درست طور پر کیا جائے تو بیشتر انسان اسلام کو اپنے دل کی آواز پائیں گے اور دوبارہ جدید تاریخ میں وہ منظر سامنے آجائے گا جس کی تصویر کشی قرآن میں ان الفاظ میں کی گئی ہے: إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا۔

حرفِ آخر

دعوت کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ یہ اللہ کے تخلیقی منصوبہ کا ایک لازمی جزء ہے۔ دعوتی عمل کے بغیر خود تخلیق کا عمل ناقص ہو جاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ دعوت کا عمل ہر زمانہ میں مسلسل جاری ہو تاکہ اس تخلیقی منصوبہ کی تکمیل ہو جس کی خاطر انسان کو زمین پر بسایا گیا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ تم زمین والوں پر رحم کرو۔ آسمان والا تم پر رحم کرے گا (ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء) اس رحمت کا تعلق صرف اخلاقی معاملات سے نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ بڑھ کر اس کا تعلق دعوت الی اللہ سے ہے یعنی لوگوں کو بتانا کہ وہ کون سی تدبیر ہے جس کو اختیار کر کے وہ آخرت کی پکڑ سے بچ سکتے ہیں اور اللہ کی ابدی نعمتوں میں اپنا حصہ پا سکتے ہیں۔ اس واقعہ کی خبر بلاشبہ لوگوں کے حق میں رحمت وشفقت کا سب سے بڑا معاملہ ہے۔

جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ زمین والوں کا درد ان کے سینہ کو تڑپائے۔ زمین والوں کے مستقبل کا مسئلہ ان کو اتنا زیادہ فکرمند کر دے کہ وہ محسوس کرنے لگیں کہ دوسروں کو خدا کی رحمت کے سایہ میں لائے بغیر وہ خود بھی خدا کی رحمت کے سایے سے محروم رہیں گے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کے دین کے سچے داعی ہیں اور آخرت کی سرفرازیاں انھیں کے حصہ میں آئیں گی۔

حضرت مسیح کے پیرو لوگوں کے پاس جاکر ان کو حضرت مسیح کا پیغام سناتے تھے۔ اس پر وہاں کے بعض فریسیوں نے کہا کہ اے استاد! اپنے شاگردوں کو ڈانٹ دے۔ اس نے جواب میں کہا۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر یہ چپ رہیں تو پتھر چلا اٹھیں گے (لوقا ۱۹:۴۰)

خدا اس پر قادر ہے کہ وہ درختوں اور پتھروں کو زبان دے اور وہ خدا کی طرف سے اس کی بات کا اعلان کریں۔ لیکن خدا اپنے منصوبۂ امتحان کے تحت یہ چاہتا ہے کہ انسانوں کے اوپر خود انسانوں کے ذریعہ اتمام حجت کیا جائے۔ ہر دور میں خود انسانوں کے

اندر سے ایسے لوگ اٹھیں جو نسل در نسل حقیقتِ واقعہ کا اعلان کرتے رہیں لیکن اگر وہ لوگ نہ اٹھیں جن کو اٹھنا ہے اور وہ لوگ نہ بولیں جن کو بولنا ہے تو خدا درختوں کو زبان دے گا کہ وہ چلائیں اور پتھروں کو حکم دے گا کہ وہ اس بات کا اعلان کریں جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہے کہ اس کا اعلان کیا جائے۔ اگر انسان اس کام کے لیے نہ اٹھیں تو خدا فرشتوں کو اس کام کے لیے اٹھائے گا۔ اگرچہ وہ خود انسانیت کے خاتمہ کا وقت ہوگا۔ کیوں کہ جب فرشتہ خدا کی بات کا اعلان کرے تو مہلتِ امتحان ختم ہو جاتی ہے۔

جب وہ وقت آجائے کہ پتھر کو چلا کر امرِ حق کا اعلان کرنا پڑے یا غیب کا فرشتہ ظاہر ہو کر انسان کو آنے والے دن کی خبر دینے لگے تو یہ اعلان کا وقت نہیں ہوتا بلکہ فیصلۂ خداوندی کے آخری ظہور کا وقت ہوتا ہے۔ یہ زندگی کا پیغام نہیں بلکہ ہلاکت کی چیتاونی ہوگی، صرف مدعو کے لیے نہیں بلکہ داعی کے لیے بھی۔

ایسی حالت میں ایک کا جرم اگر یہ ہے کہ اس نے امرِ رب کی تعمیل نہیں کی تو دوسرے کا جرم یہ ہے کہ اس نے امرِ رب کو جانتے ہوئے اس سے لوگوں کو باخبر نہیں کیا۔

کتابت : نسیم احمد اعظمی

دعوت الی اللہ کا مطلب ہے — انسان کو خدا کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) سے باخبر کرنا۔ اِس دنیا میں خدا کو سب سے زیادہ جو چیز مطلوب ہے، وہ یہ ہے کہ خدا کے بندوں تک خدا کا پیغام پہنچے۔ ایسی حالت میں جب ایک انسان دعوت کا کام کرتا ہے تو اُس کا احساس یہ ہوتا ہے کہ وہ خود خدا کا ایک کام کر رہا ہے۔ کسی بندے کے لیے بلاشبہہ اِس سے زیادہ لذیذ کوئی تجربہ نہیں کہ وہ محسوس کرے کہ میں اپنے رب کے کام میں مصروف ہوں، میں اپنے رب کے ایک منصوبے کی تکمیل کر رہا ہوں۔

ISLAMIC STUDIES

GOODWORD
www.goodwordbooks.com
ISBN 978-81-7898-739-2
9 788178 987392
₹50